شعرائے پنجاب

(عصرِ حاضر)

مرتبہ

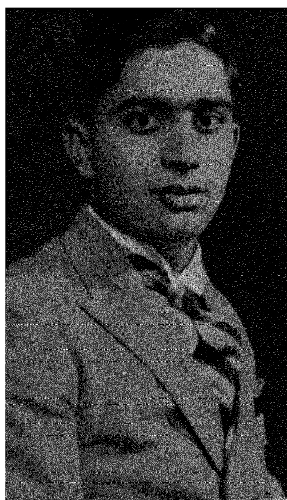
ملک محمد باقر نسیم رضوانی ایم۔ اے

سابق ریسرچ اسسٹنٹ شعبۂ تاریخ، پنجاب یونیورسٹی لاہور

ناشر

گجرات پرنٹنگ پریس گجرات (پنجاب)

اشاعت اوّل — سنہ ۱۹۳۰ء — تعداد ۱۰۰۰



نسیم رضوانی

انتساب

والدِ محترم

ملک حاکم دین صاحب سول انجینئر

کے نام سے یہ اوراق منتسب کرتا ہوں

نسیم رضوانی

دیباچہ

پانچ چھ سال قبل جب اس تذکرہ کا آغاز کیا گیا تو راقم کے عزائم نہایت بلند تھے، تجویز یہ تھی کہ ہندوستان کے عصرِ حاضر کے جملہ شعرا کے سوانح حیات مرتب کئے جائیں، چنانچہ توضیح طلب امور کے متعلق ایک استفسار نامہ (QUESTIONAIRE) تمام شعرا کی خدمت میں ارسال کیا گیا۔ بیشتر حضرات خاموش رہے، کمتر نے جواب لکھنے کی تکلیف گوارا کی، اور اُن میں سے بھی چند ایک نے سوانح حیات ارسال کئے، باقی حضرات نے مختلف عذر پیش کر دیئے، جن میں سے کچھ یہ تھے:۔

'صاحب میں کب کا شاعر ہو گیا ہوں جو آپ تذکرہ میں میرا حال لکھیں گے'۔

'سوانحِ حیات کیا ہیں یہی کہ پیدا ہوا تھا اور جی رہا ہوں'

'آپ کا ملفوف ملا۔ میں اس قابل نہیں کہ تذکرہ میں میرا ذکر ہو، اس لئے مجھے اِس تکلیف سے معاف رکھئے'

یہ جوابات جس قدر حوصلہ شکن تھے اسی قدر ہمارے شعرا کی ذہنیت کے آئینہ دار تھے، لیکن چونکہ کام شروع ہو چکا تھا بلکہ کسی حد تک مکمل بھی، اس لئے اپنے

عزائم کی شکست تسلیم کرتے ہوئے بھی یہ سلسلہ جاری رکھنا پڑا، لیکن اس طرح کہ احاطۂ شعرا کو ہندوستان سے پنجاب تک محدود کرنا پڑا، تاکہ اس طرح تذکرہ کے مکمل ہونے کے امکانات زیادہ ہوجائیں۔ اب صرف خط لکھنے پر اکتفا نہ کیا گیا بلکہ ذاتی طور پر مختلف اہلِ فکر سے ملاقات کر کے ان کے سوانحِ حیات طلب کرنے کی کوشش کی گئی۔ ان میں سے بہت سے حضرات نے تو ہندوستان کے شعرا کے علی الرغم نہایت فراخدلی سے کام لیا اور مجھے مایوس ہونے کا موقعہ نہ دیا، لیکن چند ایک نے دوسری اور تیسری ملاقات کے بعد ایسے وعدے کئے، جو آج تک کئی سال کے بعد بھی وفا نہ ہوسکے، اس شاعرانہ ذہنیت کی تحلیل میں تو کرنے سے قاصر ہوں۔ ممکن ہے ناظرین کسی مفید نتیجے پر پہنچ سکیں۔

یہ تذکرہ صرف عصرِ حاضر کے شعرا پر مشتمل ہے ہر ایک شاعر کے کلام پر مفصل تنقید کرنے سے عمداً اغماض کیا گیا ہے، کیونکہ راقم کے خیال میں شاعر کے کلام پر اس وقت تک صحیح تنقید نہیں کی جاسکتی جب تک کہ اس کا مکمل کلام پیشِ نظر نہ ہو، اور یہ اس وقت تک ممکن نہیں، کیونکہ بہت سے حضرات کا مجموعۂ کلام تاہنوز شائع نہیں ہوا۔

علاوہ ازیں زندہ شعرا میں بہت سے حضرات کے رجحانات امتدادِ زمانہ کے ساتھ ساتھ تبدیل ہوتے جارہے ہیں، اور نہیں کہا سکتا کہ کس شاعر نے کس نوع کی شاعری میں کمال

حاصل کیا ہے یا کریگا۔ لیکن رجحانات اور امکانی ترقیوں کا مطالعہ کرنے کے لئے یہ کوشش کی گئی ہے کہ ہر ایک شاعر کا زیادہ سے زیادہ کلام انتخاب میں دیا جائے۔ تاکہ ناظرین کو فکر آرائی کے لئے موقعہ مل جائے۔ اسی خیال سے جدید اردو شاعری کے 'رجحانات' پر بھی ایک مختصر سی بحث شامل کی گئی ہے اور اس مضمون میں ہندوستان کے اُن شعرا اور انواع شاعری پر بحث کی گئی ہے جو عصرِ حاضر کی پیداوار ہیں۔

شخصیت نگاری اِس تذکرہ کا طرّہ امتیاز ہے۔ راقم نے صرف ذاتی مشاہدات کو قلمبند کیا ہے لیکن اس غرض سے نہیں کہ کسی شاعر کے ادبی ذوق کی نوعیت میں کمی ہو بلکہ اس خیال سے کہ قارئین جہاں کسی شاعر کے کلام سے محظوظ ہوں وہاں اُس کی شخصیت سے بھی مانوس ہو سکیں۔

اِس تذکرے کی ترتیب میں مُحبّی منصور احمد صاحبؔ مدیر 'ادبی دُنیا' نے مجھے امکانی مدد دی ہے۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہو گا کہ اُن کی اعانت کے بغیر یہ تذکرہ مکمل ہی نہ ہو سکتا۔ اُن کی عنایات کے لئے میں بہت ممنون ہوں۔

شعرا کے حالات اُنکی عمر کے لحاظ سے پہلے اور پیچھے درج کئے گئے ہیں۔

نسیم رضوانی

ستمبر ۱۹۳۶ء

جدید اردو شاعری کے رجحانات[1]

جدید اردو شعراء سے میری مراد معین طور پر صرف ان شعراء سے ہے۔ جو عہدِ حاضر یعنی بیسویں صدی کے آغاز یا انیسویں صدی کے اواخر سے تعلق رکھتے ہیں۔ کیونکہ اردو شاعری کے جن خصائص یا اردو شعراء کے جن رجحانات کا میں ذکر کرنے والا ہوں۔ یہ صرف گزشتہ صدی کے قرن آخر یا عصرِ حاضر کے قرن اوّل ہی کی پیداوار ہیں۔ منظریہ شاعری کا جو بیج نظرؔ نے بویا تھا۔ اس کی آبیاری آزادؔ اور حالیؔ نے کی۔ اور اس صدی میں افسرؔ اور جوشؔ کی مساعی اس نخل کو بارور کرنے میں کامیابی سے ہمکنار ہوئیں۔ امیرؔ، داغؔ اور مومنؔ کے رنگ تغزل میں عابدؔ، اخترؔ شیرانی، اکبرؔ (جلال الدین)، اور حامد علی خاں نے ہر وہ کمی پوری کی جو جذبات کے باطل عکس اور خیالات کے فرضی افسانوں کے بیان کی وجہ سے پیدا ہو گئی تھی۔ ذیل میں ان چند ایک خصوصیات کا ذکر کیا گیا ہے۔ جو میرے خیال میں جدید شاعری کے

---

[1] یہ مضمون نگار (لکھنؤ) کے لئے لکھا گیا تھا۔ مکمل ہونے پر اُردو سبھا لاہور کے زیر اہتمام یونیورسٹی لیبارٹریز میں پنڈت برجموہن صاحب کیفی دتاتریہ کی صدارت میں پڑھا گیا اور زمیندار میں شائع ہوا۔

انقلاب کی آئینہ دار ہیں۔ اگر یہ استفسار کیا جائے۔ کہ ان خصوصیات کی توضیح کیلئے چند ایک مخصوص شعرا کا کیوں ذکر کیا گیا ہے اور دیگر حضرات کو کیوں حذف کر دیا گیا ہے۔ تو اس کا جواب صرف یہی ہے۔ کہ چونکہ عہد حاضر کے شعرا میں سے بہت سے حضرات کا مجموعہ کلام شائع نہیں ہوا۔ اس لئے ان کے کلام کے انتخاب کا ماخذ صرف ملک کے اردو جرائد ارد "معارف، نگار، ہمایوں اور ادبی دنیا" ہی تھے۔ اور ان حالات میں اگر تفصیلاً ہر ایک شاعر کا کلام نمونہ کے طور پر پیش نہیں کیا جا سکا۔ تو اُسے میری مجبوری پر محمول کیا جائے۔

۱۔ جدید تغزّل

جدید شاعری میں غزل میں جو اہم اصلاح ہوئی۔ وہ گل و بلبل کے افسانوں' نالہ و شیون کے فرضی شور حشر انگیز' غم و فرقت کی غیر موجود طویل راتوں اور شکوہ و شکایت، کی غیر معقول داستانوں کے بیان سے قطع تعلقی تھی۔ عہد حاضر کے معاصرین نے محسوس کیا۔ کہ غزل کے ان اجزا میں کسی طرح کی صداقت نہیں ؎

کس نے کہا کہ داغ وفادار مر گیا
وہ ہاتھ مل کے کہتے ہیں کیا یار مر گیا

کی طرح کے اشعار سامع کے دماغ پر شاعر کی ایک مضحکہ انگیز کیفیت کے سوا اور کوئی اثر نہیں

ڈال سکتے۔ ہماری روزمرہ کی زندگی کے واقعات کچھ اتنے غیر وقیع نہیں۔ کہ ان کو اگر دلچسپ اسلوب میں بیان کیا جائے۔ تو وہ سامع کے دل و دماغ کو زندگی کے ان حقائق سے آشنا نہ کر سکیں۔ جو ہم پر صحیح طور پر کیفیت تاثر طاری کر سکتے ہیں۔ چنانچہ عہد حاضر کے بہت سے شعرا نے اسی جذبہ کے زیر اثر جدید غزل نگاری کی طرح ڈالی! ورنہ یہ کہا جا سکتا ہے۔ کہ ان کے اشعار میں بیشتر وہ صداقت موجود ہے۔ جو ہمارے دلی جذبات کا حصّہ ہے۔ اور ان جذبات کا حصّہ ہے۔ جو ہر ایک انسان کی حیاتِ معاشقہ اور رومانی دور کی پیداوار ہیں۔ محمّد کبیر خاں رسا کسی کی "نگہ اوّلین" کی کیفیت تاثر کو نظم کرتے ہوئے لکھتے ہیں ؎

نظر ہاں وہ نظر کہتے ہیں جس کو موج بیتابی
نکل کر ان کی آنکھوں سے سرائت کر گئی دل میں

حامد علی خاں عہد حاضر کے بہت ثقہ غزل گو ہیں لیکن آپ کی غزلیات میں رومانی حقائق کو بیان کرنے کا رجحان نظر آتا ہے۔ دو اشعار ملاحظہ فرمائیے۔

؎ پہلو میں اک جہان کو ہم لے کے مٹ گئے
یہ حشر دل کا آہ قیامت ہی تو ہے

؎ گلزار کے سایوں میں وہی حشر بپا ہے
پھولوں سے ابھی تک تری خوشبو نہیں جاتی

دوسرا شعر عشرتِ رفتہ کی یاد کا نادر نمونہ ہے۔

سید سلیمان ندوی اپنی دیگر ادبی اور علمی تخلیقات کی طرح غزل میں بھی بے تکلفی سے کام لیتے ہیں۔

عجیب طرح کا اک پیچ گفتگو میں ہے　　وگرنہ "میں" میں وہی بات ہے جو "تو" میں ہے

نگاہ لطف ادھر ہو کہ آچلا ہے کیف　　بچا نہ رکھ مرے ساقی جو کچھ سبو میں ہے
ہزار بار مجھے لے گیا ہے مقتل میں　　وہ ایک قطرۂ خون جو رگ گلو میں ہے
قفس میں نالہ نہ کر مرغ صحن باغ سے دور　　کہ لطف شکوۂ یارانہ روبرو میں ہے

آخری اشعار کتنے بلند منتہائے مدعا کی تعلیم دیتے ہیں۔

غزل میں جو دوسری اصلاح جدید شعراء کے پیش نظر تھی وہ غزل کو ہموار کرنے اور اشعار میں تسلسل پیدا کرنے کا خیال تھا۔ اس کی طرف رجحان دن بدن بڑھ رہا ہے۔ جدید شعرا اشعار کی تعداد سے بے نیاز ہو کر تمام غزل ہموار اشعار سے مرتب کرتے ہیں متقدمین میں اس کی مثالیں آپ کو بہت کم ملیں گی۔ ان دنوں اشعار کی تعداد پورا کرنا فرض سمجھا جاتا تھا خواہ ان میں کسی طرح کا تسلسل ہو یا نہ ہو۔

غالب کے سارے دیوان میں مشکل ایک دو مسلسل غزلیں نظر آئیں گی۔ عابد کی ایک

مختصر سی غزل ملاحظہ فرمایئے۔ جملہ اشعار ایک خاص کیفیت کے حامل ہیں۔

سیّد عابد علی عابدؔ

کمالِ صبر و ضبط ہے یہ میری بود و ہست ہے
دیارِ عاشقی میں حوصلوں کی راہ پست ہے

سنی ہے میں نے بات یہ کسی شراب خوار سے
خوشا وہ بندۂ جنوں جو کیفِ غم سے مست ہے

نظر ہے کامگارِ حُسن یار پھر بھی خوش نہیں
یہ بند و بست عشق ہے کہ فتح کو شکست ہے

شباب کا لحاظ بھی ہے دل کی احتیاط بھی
خیال پاک باز ہے نظر صنم پرست ہے

یہ عابدؔ وفا پرست کی صدائے عشق ہے
یہ موجۂ بہار ہے کہ نغمۂ الست ہے

اشعار کے تسلسل کے لئے حسرتؔ (چراغ حسن) کے اشعار ملاحظہ ہوں۔

چراغ حسن حسرتؔ

محبت کس قدر یاس آفریں معلوم ہوتی ہے
ترے ہونٹوں کی ہر جنبش نہیں معلوم ہوتی ہے

یہ کس کے آستاں پر مجھ کو ذوقِ سجدہ لے آیا
کہ آج اپنی جبیں اپنی جبیں معلوم ہوتی ہے

جوانی مٹ چکی لیکن خلش دردِ محبت کی
جہاں معلوم ہوتی تھی وہیں معلوم ہوتی ہے

امیدِ وصل نے دھوکے دیئے ہیں اس قدر حسرت

کہ اس کافر کی ہاں بھی اب نہیں معلوم ہوتی ہے

اس عہد میں غزل میں ایک اور بہتم بالشان انقلاب ہؤا۔ اور وہ یہ ہے کہ چند صحیح ذہنیت کے شعراء نے اپنا مخاطب مرد کی بجائے عورت کو قرار دیا۔ عابد اور اختر شیرانی کے دو اشعار ملاحظہ ہوں۔

عابد

گلپاش و زرنگار ہے گجرات کی زمیں   ہے اس جگہ قیام میری مستِ ناز کا

اختر شیرانی

بس کر او رونے والی آنکھو اب تو بس کرو   اب تو اپنے ظلم پر وہ بھی پشیماں ہو گئیں

اردو ادب کے مورخوں نے کبھی کبھی یہ سوال اٹھایا ہے کہ متقدمین محبوب کو مذکر کیوں نظم کیا کرتے تھے۔ لیکن اکثر حضرات نے اس کا یہی جواب دینا کافی سمجھا ہے کہ جس طرح اردو کی شاعری نے عروض و قافیہ فارسی شاعری سے مستعار لیا ہے۔ اسی طرح فارسی شعراء کی امرد پرستی بھی مستعار لی گئی ہے۔ لیکن میرے خیال میں یہ جواب ناکافی ہے۔ میرے نزدیک یہ حقیقت ہے کہ ہمارے اکثر شعراء کم از کم ذہنی امرد پرستی میں ضرور مبتلا تھے۔ کیونکہ

انہیں صنفِ نازک سے بے باکانہ طور پر اظہارِ تعشق کا موقعہ ہی نہیں ملتا رہا۔ اس لئے اگر وہ اپنا محبوب مذکر نظم کرتے رہے ہیں تو یہ فارسی شاعری کا لابدی اثر نہ تھا۔ بلکہ اس میں حالات کو بھی کچھ دخل تھا۔ باور نہ ہو۔ تو ذیل کے اقتباسات سُن لیجئے۔ مصحفی فدوی کے تذکرہ میں لکھتے ہیں۔

"زیادہ از مرتبہ شاعری قدم در راہ امرد پرستی میگذاشت۔ چند جا خانہ جنگی ہم کردہ۔"

میر حسن افضل دکنی کے متعلق فرماتے ہیں:۔

"کدام ہندو بچہ گوپال نام بود کہ بر و عاشق شدہ حسبِ حال خود بارہ ماسہ عرف بکٹ کہانی گفتہ کہ اکثر کھتریاں وگانیاں مشتاق می باشند۔"

میاں صلاح الدین پاکباز کے متعلق لکھا ہے۔

"شنیدہ ام کہ در لکھنؤ آمدہ بر سوہنا و لکھن کہ قوال بچہ مشہور اند نظر التفتے داشت عاشق و معشوق ہر دو ہم نام گویا خود بر خود عاشق بود۔ چنانچہ در عشق او خود گفتہ

بہیں ندیاں مرے آنسو سے جو میں ہجر میں رویا
کہے ہے ساری بستی ہائے لکھن نے ہمیں کھویا"

لیکن ان دنوں چونکہ مغربی تمدن و معیشت کا دور دورہ ہونے کی وجہ سے حالات تبدیل ہو چکے ہیں (مجھے اس سے غرض نہیں کہ حالات کی یہ تبدیلی مستحسن ہے یا نہیں)

اس لئے ہمارے نوجوان شعرا کو اپنا مرکزِ تصوّر تبدیل کرنے کا موقعہ مل گیا ہے۔ اکبر (جلال الدین) کی ایک مسلسل نظم اسی رنگ کی حامل ہے۔

آزردگئ شوق

رہے اس شوخ سے آزردہ ہم چندے تکلف سے
تکلف برطرف تھا ایک اندازِ جنوں وہ بھی (غالب)

تجھے یقین محبت نہیں قیامت ہے — یہ رنگ لائیں مری سرگرانیاں توبہ
تجھے عبورِ حقیقت نہیں مصیبت ہے — یہ بے دلی یہ تری بدگمانیاں توبہ
یہ سمجھی تو مرے اندازِ سرگرانی سے — کہ اس کا دل نہیں لذت شناسِ الفت کا
یہ جانا تو نے میری بیہدہ بیانی سے — کہ اس کے دل میں نہیں کوئی پاس الفت کا
وفا سے جان لیا تو نے نابلد مجھ کو — تجھے خبر ہی نہیں شیوۂ جنوں کیا ہے
نہیں ہے رمزِ محبت سے آگہی تجھ کو — جو اذن ہو تو میں اجمال سے کہوں کیا ہے
وفا کا شکوۂ باطل سے آشنا رہنا — وفورِ سوزِ تمنا کی یہ علامت ہے
گلے نہیں یہ ہے سرگرمِ التجا رہنا — ہجومِ شوقِ جنوں زا کی یہ علامت ہے
ہیں اقتضائے محبت یہ خفگیاں میری — کمالِ شوق ہے آزردگی تمنا کی
نہیں ہیں واقفِ تسلیم شوخیاں میری — کہ یہ ہے اصل میں افسردگی تمنا کی

تیرے جمال کا وارفتۂ محبت ہوں ترے سوا مجھے اے جاں کسی سے کیا مطلب
جہانِ عشق میں قبلہ نما کی صورت ہوں مرے جنون کو بے راہروی سے کیا مطلب
میری وفا پہ تجھے اشتباہ ہے پیاری
گناہ ہے یہ سراسر گناہ ہے پیاری

۲۔ رومان اور منظر

جدید شاعری میں جو دوسرا انقلاب ہوا وہ رومانی اور منظریہ شاعری کا امتزاج تھا۔ انگریزی میں انیسویں صدی کے شعراء میں سے ورڈزورتھ۔ شیلے اور کولرج نے بکثرت اس روش کی پابندی کی ہے لیکن اردو میں عصرِ حاضر سے قبل بہت کم شعراء نے اس طرف توجہ کی ہے۔ اس صنف کی شاعری میں شاعر نظم کا پس منظر (BACKGROUND) منظریہ اشعار سے تیار کرتا ہے یعنی کسی باغ۔ شاداب جنگل۔ آب جو یا صحرا کی تفاصیل جزوی یا مکمل طور پر بیان کی جاتی ہیں اور اس کے بعد فطرت کی ان رعنائیوں سے عنانِ توجہ کسی انسانی پیکر کی طرف منعطف کر لی جاتی ہے۔ یا بعض دفعہ یہی دونوں عمل پہلو بہ پہلو روا رکھے جاتے ہیں یعنی منظریہ حسن کی تفصیل کے ساتھ ساتھ اُن عشقیہ اور رومانی جذبات اور کیفیات کو نظم کیا جاتا ہے۔ جو کسی انسانی پیکر کے تماشا کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ ایسی نظمیں

لکھنے والے شاعر کی کیفیت بالکل اس مصوّر کی سی ہوتی ہے جو بالخصوص چاہتا تو یہ ہے کہ اپنے موقلم سے حیاتِ انسانی کے کسی ارفع رخ کو پیش کرے لیکن صفحہ قرطاس پر صرف چہرہ یا کسی دیگر عضو کی نمائش اس لئے نہیں کرتا. کہ اس طرح سے جمیل نقوش کی تخلیق کے باوجود کوئی مانوس مجموعہ رنگ وخط تیار نہیں ہو سکے گا اور ضرورت کی وجہ سے پس منظر کے لئے قدرتی مناظر کی پناہ ڈھونڈھ لیتا ہے یہی حال اس شاعر کا ہے جو ایسی رومانی نظمیں لکھتا ہے۔ ان کا پس منظر منظریہ اشعار سے تیار ہوتا ہے۔ شاعر کا اصلی مقصد منظر کی رعنائی بیان کرنا نہیں ہوتا. بلکہ یہ تکلیف صرف ضرورت کی وجہ سے گوارا کی جاتی ہے اور بعد میں رومانی منظر کچھ اس وفور سے شامل کیا جاتا ہے کہ تمام نظم ایک نغمۂ محبت بنکر رہ جاتی ہے اور سامع کا تصور شاعر کے تخیّل کا ہم آہنگ ہوکر حسن وعشق کی زندہ تصویریں اس کے سامنے پیش کردیتا ہے۔

شاعری کی اس صنف میں سب سے پہلے موجودہ دور کے شعراء میں سے جس شاعر کی نظم بہت مقبول ہوئی۔ وہ اختر شیرانی تھے۔ یہ نظم "قوسِ قزح" مرحوم میں "اے عشق کہیں لے چل" کے عنوان سے شائع ہوئی تھی۔ اس کا ایک منظریہ بند پیش کیا جاتا ہے جس میں محبت کرنے والے دل کی خلوت پسندی کا اظہار کیا گیا ہے۔

سنسار کے اس پار اک اس طرح کی بستی ہو

جو صدیوں سے انسان کی صورت کو ترستی ہو
اور جس کے مناظر پہ تنہائی برستی ہو
یوں ہو تو وہیں لے چل
اے عشق کہیں لے چل

ڈاکٹر سعید احمد بریلوی نے معدودے چند نظمیں کہی ہیں لیکن میر درد کی طرح ان کا بھی محدود کلام ابدی شہرت حاصل کر چکا ہے۔ اُن کی نظم "دوشیزۂ کہسار" میں مناظر فطرت کے پہلو بہ پہلو تماشائے اولیں کی کیفیات کا مرقع کھینچا گیا ہے۔ شاعر پہلے دوشیزہ کا سراپا بیان کرتا ہے لیکن اس پیکر جمیل کا 'دست پابند حنا' اور رخسار رہنِ غازہ' نہ ہونے کے باوجود شاعر سے خراجِ تحسین وصول کر لیتا ہے۔

اعضا متناسب ہیں طرز ہے جانانہ — کیا قامت موزوں ہے کیا چال ہے مستانہ
صرف اُس کی جوانی ہے کُل زیور تن اُس کا — ہے رشک صد آرائش بے ساختہ پن اس کا
منت کشِ سُرمہ ہے کب آنکھوں کی رعنائی — مہندی سے نہیں مطلق ہاتھوں کی شناسائی
رغبت ہے طبیعت کو منجن سے نہ مسی سے — سدھ بدھ ہے نہ چوٹی کی مطلب ہے نہ کنگھی سے
پروا نہیں بالوں کی چھٹکے ہیں کہ نکھرے ہیں — شانوں پہ وہ گر گر کر بکھرے ہیں تو بکھرے ہیں
کُرتا ہے تو میلا سا چادر ہے تو بوسیدہ — گو مانگ نکالی ہے پر آئینہ نادیدہ

دو سہیلیاں ندی پر غسل کرنے کی خاطر آئی ہیں اور سر کھول کر لب جو منہ دھونے بیٹھ جاتی ہیں۔ شاعر منظر فطرت اور حسن کی زندہ تصویروں سے متاثر ہو کر کہتا ہے۔

بیٹھیں لب جو دو نو سر کھول کے منہ دھونے ۔۔۔ دریا کے حبابوں سے پھر کھیل لگا ہونے
کوشش ہے کہ آجائے اک ببلہ مٹھی میں ۔۔۔ ناکامی کے غصہ سے بل پڑ چلے تیوری میں
جھنجلا کے وہ پانی کو ہاتھوں سے ہلاتی ہے ۔۔۔ اس طرح حبابوں کو گویا کہ مٹاتی ہے
ہستی کے لئے اپنی لیکن وہ جھگڑتے ہیں ۔۔۔ بن جاتے ہیں اُتنے ہی جتنے کہ بگڑتے ہیں
اس میں بھی نظر آئی جب صورت ناکامی ۔۔۔ ہنس ہنس کے مٹاتی ہے اب خفت ناکامی

خدا مغفرت کرے ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری بہت تھوڑے دن جئے ورنہ جانے ان کی شاعری کہاں تک فروغ پاتی اور وہ بھی ایک مستقل سکول کے بانی قرار پاتے۔ ان کی اکثر نظموں میں منظر اور رومان کا امتزاج کچھ اس خوبی سے ہوا ہے کہ اس کی نظیر شاید ہی کہیں دستیاب ہو سکے نظم ملاحظہ ہو:-

صنم فرنگ، قمر جبیں، بت سیم رنگ، غضب حسیں
وہ عذار نازک وشہ رگیں کہ رقیب ساغر آتشیں
وہ ہوا میں کاکل عصفریں کہ شہاب ثاقب شب رواں
وہ ثبات غنچہ گلاب گوں، وہ لب گداز پُر از فسوں

مژۂ دراز کج و نگوں میں نہاں دو دیدۂ نیلگوں!

کہ سحر کے پردۂ ارغواں میں فضائے گنبدِ آسماں

تجھے میں نے دیکھا ہے اک نگہ نہیں مجھ سے تو ذرا آشنا

ترے عشق میں ہوں میں مبتلا بسلاسلِ الم وبلا

مجھے کیا پتہ کہ ہے اب کہاں تجھے کیا خبر گئی کسکی جاں

اشعار کی موسیقی کے علاوہ تشبیہات کی ندرت قابلِ داد ہے۔

۳۔ فلسفہ

اردو کے جملہ شعراء میں سے فلسفہ کے رموز و نکات بیان کرنے میں مرزا غالب کا پایہ سب سے بلند تسلیم کیا گیا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اس کے فلسفہ میں تشائم کا عنصر غیر معمولی طور پر زیادہ ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ شوپنہار کی طرح جب وہ اپنی اذیتوں کو بیان کر کے زندگی کو ایک المیہ قرار دیتا ہے۔ تو ہم اس کے سبق کو نوجوانوں کے لئے مضر سمجھتے ہوئے بھی اس کی داد دینے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ یہ اس لئے ہے کہ اسکے بیانات اکثر ہمیں اُن ناکامیوں اور ان تلخ تجربات کی یاد دلاتے ہیں۔ جن سے ہمیں اس دنیائے تگ و دو میں دوچار ہونا پڑتا ہے۔ اس لئے اگر یہ کہا جائے کہ غالب اردو شعراء میں سے

پہلا شاعر تھا جس نے فلسفہ حیات کے ایک اہم رُخ کو واضح کیا تو غلط نہ ہوگا۔ لیکن غالب کے بعد مستقل طور پر عہدِ حاضر کے کسی شاعر نے فلسفہ کو موضوعِ کلام نہیں بنایا۔ البتہ گاہے گاہے کئی اصحاب نے کسی ہنگامی جذبہ سے متاثر ہو کر ضرور کچھ کہا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ کسی دن فلسفیانہ اشعار کہنے والے حضرات کا یہ رجحان انہیں یا اُنکے پیرووں کو ایک مستقل روش اختیار کرنے پر مجبور کر دے گا۔ مثلاً حضرت ایمن حزیں نے کسی وقت موت پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ ملاحظہ ہو کہ انسانی ذہن اس اٹل شدنی کے متعلق کیا کیا سوچتا ہے۔

موت

فطرت کا التفات کہیں یا جفا کہیں ۔۔۔ حیرت میں ہیں کہ موت کے منظر کو کیا کہیں
انجامِ بود ہے کہ یہ آغازِ نیست ہے ۔۔۔ کوئے فنا کہیں درِ دارِ فنا کہیں
وابستہ گر نمود سے ہے بودِ زندگی ۔۔۔ پھر تو بجا ہے موت کو آفت بلا کہیں
لیکن اگر نمود کرشمہ ہے بود کا ۔۔۔ کیوں موت کو نہ زیست کا اک شعبدہ کہیں

آنکس کہ زندہ است و ندارد حیات را
در حیرتم چہ طور بداند ممات را

جناب محمود اسرائیلی نے انسانی فطرت کے ایک بدنما رُخ کا مطالعہ کیا تو

انہیں مجبور ہو کر ایک نظریہ قائم کرنا پڑا۔ کہ :۔

جہاں میں حسنِ گُل و رنگِ آب و گِل بدلا　　ھزار حیف کہ انسان کا نہ دل بدلا
ازل سے دیکھتے آئے ہیں اس کی فطرت کو　　شقاوتوں میں نہ اب تک یہ ایک تِل بدلا

آپ کو اس نظریہ سے اختلاف ہو۔ یہ الگ بات ہے لیکن اگر آپ کے تجارب بھی حضرت محمود اسرائیلی کے سے ہیں۔ تو آپ کو اس فلسفہ کا قائل ہونا ہی پڑے گا۔ کہ فطرت کی جُملہ تخلیقات میں تغیر و تبدل ہونے پر بھی انسان کا دل ازلی شقاوت کا حامل ہے۔

ایمنؔ حزیں نے ایک اور موقعہ پر میں اور تو کے عنوان سے اس طرزِ زندگی کو فلسفیانہ انداز میں بیان کیا ہے جس کے وہ حامی ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ اُن کے نظریہ سے ہر ایک کو اتفاق ہو لیکن فلسفی شاعر نے اپنا فرض ادا کیا ہے۔ ملاحظہ ہو:۔

مَیں اَور تُو

تو عیش کا دلدادہ میں درد کا دیوانہ　　تو درد سے بے بہرہ میں عیش سے بیگانہ
معنی مرا آئینہ صورت پہ نظر تیری　　عنوانِ حقیقت میں تو سُرخیٔ افسانہ
تو ساز پہ مفتوں ہے میں سوز پہ مرتا ہوں　　بھونرے کا مقلد تو میں پیروِ پروانہ

تشکیک کے صحرا میں گم کردۂ منزل تُو | ایقان کے کوچہ میں ہیں بردرِ جانانہ
دریوزہ گری کی شیوہ ہے یہ شہد وں کا | رندی اسے کہتے ہیں پہلو میں ہے خمخانہ

گاہے گاہے کئی اصحاب نے عملی زندگی کے متعلق اپنے قابلِ قدر خیالات کا اظہار کیا ہے۔ جو خود بہت حد تک اُن کی اپنی زندگی کے آئینہ دار ہیں۔ یہ فلسفیانہ حقیقت بیانی متقدمین میں بہت کم نظر آتی ہے۔ عبدالطیف شاؔد مندرجہ ذیل انداز میں تلقین عمل کرتے ہیں۔

دعوتِ عمل

سیلِ خودی سہی لیکن وہ عمل کوش تو ہے | موج قاصر سہی جنبش سے وہ ہمدوش تو ہے
قطرے بے نظم سہی ان میں مگر جوش تو ہے | آبِ سیال میں اک طاقتِ خاموش تو ہے

موجیں کچھ سعی تو کرتی ہیں پریشان سہی
جوش پیدا تو ہو آندھی سہی طوفان سہی

پھر اس دُنیا کے فلسفہ ایثار و تحصیل کو کس خوبی سے بیان کیا ہے۔

تخریب میں تعمیر

طرحِ تعمیر سے کیا کیا نہ مقدر بگڑے | ایک آئینہ بنا سینکڑوں جب گھر بگڑے

لاکھوں اک سنگ کی پرواز میں جو ہر بگڑے　　ایک ہنگامہ بنا جب کئی محشر بگڑے

آہ ہوتی ہے پریشاں تو نوا بنتی ہے!

لاکھوں گھر مٹتے ہیں جب ایک فضا بنتی ہے

اثر صہبائی کی رباعیات میں بھی وہ فلسفہ موجود ہے جو انسان کو بدترین حالات میں بھی اپنی شکست تسلیم کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ کیونکہ مایوسی بھی ایک قسم کی موت ہے ملاحظہ ہو:۔

مسجد میں رہینِ سبحہ خوانی کب تک　　اندیشۂ رزمِ زندگانی کب تک

زندہ ہے تو کارزارِ ہستی میں نکل　　یہ فکرِ شکست و کامرانی کب تک

غیروں سے تجھے امید دلجوئی ہے　　اک عمر خیالِ خام میں کھوئی ہے

ہر ایک ہے اپنے اپنے غم کا درماں　　درماں جو کسی کے غم کا ہو کوئی ہے

ناکامئ زندگی سے ڈرنا کیسا　　ہنگامِ شکست آہ بھرنا کیسا

زندہ ہے اگر تو ننگِ ہستی کیوں ہے　　یہ موت سے پیشتر ہی مرنا کیسا

اب اس کی طرف رجحان بڑھتا چلا جارہا ہے فلسفۂ محبت پر اردو شعراء نے

بہت کم توجہ کی ہے لیکن عطاء اللہ سجاد کی ایک نظم ملاحظہ فرمائیے۔ اس میں محبت کے جاودانی (ETERNAL) ہونے پر کس خوبی سے اور کس پاکیزہ انداز میں اظہار خیالات کیا گیا ہے:-

محبّت کی حیاتِ جاوداں

محبت کے گلستاں کی بہاریں جاودانی ہیں
محبت کے گلوں کو کھل کے مرجھانا نہیں آتا
فریبِ رنگ و بو دے کر بکھر جانا نہیں آتا
انہیں جورِ خزاں کا کوئی افسانہ نہیں آتا

سکوتِ مرگ سے ناآشنا ہیں عشق کے نغمے
ربابِ عشق کی تاریں ہمیشہ تھرتھرائیں گی
اور اپنی لرزشِ پیہم سے موسیقی لٹائیں گی
سرورِ کیف سے بزمِ جہاں کو جگمگائیں گی

محبت کی حکومت ہے دو عالم کی فضاؤں پر
جہازِ عمرِ فانی کی محبت ناخدا بھی ہے

ہوس کی شیطنت کاری سے سرگرم وغا بھی ہے
غموں کے تیرہ صحرا میں ضیائے رہنما بھی ہے
محبت آتی ہے دنیا میں عمرِ جاوداں لیکر
اگر شیرازۂ ہستی بکھرتا ہے بکھر جائے
وفا کے کھیل میں بازی اگر ہرتی ہے ہر جائے
محبت اس لئے پیدا نہیں ہوتی کہ مر جائے

۴۔ طنز

متقدمین کے کلام میں اگر طنزیہ کلام کو تلاش کیا جائے تو اس کی بہت سی مثالیں ملیں گی خصوصاً اُس زمانہ کا بہت سا کلام تو صرف طنز پر مشتمل ہوگا جب شعراء شاعروں میں ایک دوسرے کی پگڑی اچھالا کرتے تھے۔ اور طنز بعض دفعہ حدود سے تجاوز کر کے ہذل کی حد تک پہنچ جاتا تھا۔ ارتقائے تہذیب و تمدن کے ساتھ طنزیہ کلام کا فقدان ہونے لگا۔ یا زیادہ صحیح طور پر شعراء نے طنز کو تہذیب کے پردوں میں ملفوف کر دیا اور ذاتیات سے گریز کرتے ہوئے عمومی حیثیت سے تبصرۂ طنزیہ اشعار کا استعمال کیا۔ چنانچہ عہدِ حاضر کے شعراء نے جب کبھی

کبھی طنزیہ اشعار لکھے ہیں تو اُن میں طنز کا نہایت لطیف عنصر شامل کیا ہے علاوہ ازیں یہ اشعار خاص حالات میں خاص جذبات سے متاثر ہو کر لکھے گئے ہیں مجید ملک صاحب نے بہت کم نظمیں لکھی ہیں۔ یا میری نظر سے نہیں گذریں۔ بہرحال اُن کی ایک ایسی نظم ذیل میں پیش کی جا رہی ہے جس میں انہوں نے حُسن و عشق کے ابتذال سے متاثر ہو کر چند طنزیہ اشعار لکھے ہیں۔

رسوائیاں

حُسن اب کیا ہے فقط آرائشیں آرائشیں
خود فروشی کے لئے زیبائشیں زیبائشیں
میں نے اِن آنکھوں سے دیکھے ہیں حسیں بکتے ہوئے
کوچہ و بازار میں ناز آفریں بکتے ہوئے
حُسن کی شب خود نمائی کے سوا کٹتی نہیں
سخت حیرت ہے تعجب ہے زمیں پھٹتی نہیں
وہ پرانی شانِ خودداری وہ عفت کھو چکا
عشق روتا ہے کہ ہائے حسن رسوا ہو چکا

متذکرہ الصدر اشعار میں طنز کا پہلو نہایت لطیف تھا لیکن گا ہے گا ہے جب کسی شاعر کے جذبات پر کسی منظر نے حد سے زیادہ اثر کیا ہے۔ تو تاثرات ہمہ تن طنز ہو کر صفحہ قرطاس پر منتقل ہو گئے ہیں۔ چنانچہ ذیل میں اس نوع کی ایک نظم کے چند اشعار پیش کئے جاتے ہیں۔ جو حضرت جوش ملیح آبادی کی تخلیق ہے۔

خانقاہ

الاماں خانقاہ کی دنیا
معصیت کی گناہ کی دنیا

یاں خودی کا لقب ہے یادِ خدا
ترکِ دنیا کے بھیس میں دنیا

دل سے ہے بند رسم و راہ یہاں
صرف جیبوں پہ ہے نگاہ یہاں

جمع کرتے ہیں یاں زر و گوہر
جاہلوں کو اجل سے دھمکا کر

بات آتا ہے روزِ گنج خطیہ
ذکر دوزخ ہے اس جگہ جاگیر

یاں بہت سے کمال آتے ہیں
نذریں ملتی ہیں حال آتے ہیں

نغمہ چاندی میں ہاتھ دھوتا ہے
ڈھول کی گت پہ رقص ہوتا ہے

یاں زر و مال دینے آتے ہیں
لوگ اولاد لینے آتے ہیں

ہر حکایت ہے یاں زر و گوہر
خُلد ملتی ہے یاں کرائے پر

سُبحہ گرسنہ کا ہر دانہ   کہہ رہا ہے غذا کا افسانہ
ہے یہاں کفر خیز و شرک پناہ   نعرہ لَا اِلٰہَ اِلاَّ اللہ
یاں کے ذرے نہیں نگینے ہیں   یاں مقابر نہیں دفینے ہیں
صورتیں غرقِ خود نمائی ہیں   ڈاڑھیاں کاسۂ گدائی ہیں

کون بہتر ہے ایزدی باری
اُن کا تقویٰ کہ میری میخواری

۵۔ وضعی نظمیں

جدید شاعری میں نظموں کی قدیم وضع کو تبدیل کرنے کا رجحان دن بدن زیادہ ہو رہا ہے۔ اردو میں ساقی نامہ مفقود تھا۔ لیکن اب سید عابد علی صاحب عابدؔ کے علاوہ علامہ سر اقبال اور ابو الاثر حفیظ جالندھری نے بھی ساقی نامے لکھے ہیں متقدمین کے دور میں ملکی زبان کا اثر غالب تھا۔ اس لئے اس وقت گیت لکھے جاتے رہے۔ لیکن پھر گیت لکھنے یک قلم ترک کر دئے گئے۔ عصر جدید کے شعراء نے پھر ان کا احیائ کیا۔ چنانچہ ابو الاثر حفیظ جالندھری، حفیظؔ ہوشیارپوری، پروفیسر تاثیرؔ اور اختر شیرانی نے کافی تعداد میں گیت لکھے۔ ابو الاثر حفیظ جالندھری کا "پریت کا گیت" اور پروفیسر

تاثیر کے گیت "تم بھی پریت کرو نوجوانو" خاص طور پر پڑھنے کے قابل ہیں۔ سید مقبول حسین نے اردو رسم الخط میں ہندی کے کئی گیت لکھے ہیں۔ جو وقتاً فوقتاً ہمایوں اور ادبی دنیا میں شائع ہوتے رہے ہیں۔

انگریزی علم و ادب کے مطالعہ کا اثر ہمارے نوجوان شعراء پر پڑا۔ تو اُنہوں نے انگریزی وضع کی نظمیں اردو میں لکھیں۔ سانٹ کو اس دور سے پہلے کبھی کوئی جانتا بھی نہیں تھا۔ سب سے پہلے سانٹ کے طرز میں قاضی احمد میاں اختر جوناگڈھی نے ایک نظم لکھی۔ پنجاب میں اختر شیرانی اور راشد وحیدی نے بہت سے سانٹ لکھے۔ بہت ممکن ہے۔ کہ یہ رجحان کسی دن انگریزی وضع کی دوسری نظموں کو حلقہ اردو میں لے آئے۔

بے قافیہ نظمیں قدماء نے بھی لکھی ہیں متوسطین شعراء میں زیادہ تر آتش و رند کی توجہ اس طرف منعطف رہی لیکن متاخرین اس روش کو بالکل بھول گئے۔ اس دور میں پھر شعراء نے اس طرف توجہ کی ہے۔ ایسی نظمیں لکھنے والوں میں صوفی غلام مصطفےٰ تبسم، پنڈت تلوک چند محروم اور راشد وحیدی کے نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ بلکہ راشد وحیدی تو ایک آزاد قسم کی نظمیں لکھ رہا ہے جن میں قافیہ و ردیف کو ترک کرنے کے علاوہ پرانی وضع کو بھی ترک کر دیا گیا ہے۔ ذیل میں اس کی ایک نظم قارئین

کی دلچسپی کے لئے درج کی جاتی ہے۔

زوال

آہ پائندہ نہیں
یہ ملاقات کا ہنگامِ جلیل
پھر کئی بار ابھی آئیں گے لمحاتِ جنوں
اس سے شدت میں فزوں اس سے طویل

پھر بھی پائندہ نہیں!
آپ ہی آپ کسی روز ٹھہر جائے گا

تیرے جذبات کا دریائے رواں!
تجھے معلوم نہیں،
کس طرح وقت کی امواج ہیں سرگرم خرام!

ایک دن تیرا دل افروز جمال
کر دیا جائے گا بیگانۂ نور!

تیرے ہونٹوں کا سرور
نکہت ورنگ سے محروم دوام
تجھے معلوم نہیں ؟
اس دریچے میں سے دیکھ!
خشک بے برگ، الم ناک درختوں کا سماں
کیسا دلدوز سکوت
زیرِ لب نالہ کش جورِ خزاں!
چودھویں رات کا مہتابِ جواں
اُن کی اس سمت سے ہے نزدِ طلوع
تجھے معلوم نہیں،
ایک دن تیرا جنوں خیز شباب
تیرے اعضا کا جمال
کر دیئے جائیں گے اس طرح سے محروم فسوں
اور پھر چاند کے مانند محبت کے خیال

سارے اس عہد کے گذرے ہوئے خواب
تیرے ماضی کے افق پر سے ہویدا ہونگے!
تجھے معلوم نہیں ؟

یہ نظم صرف قافیہ و ردیف سے ہی بے نیاز نہیں بلکہ وضع کے لحاظ سے اپنی نظیر آپ ہی ہے۔

نسیم رضوانی

ترتیبِ شعرا

شمار	نام	صفحہ
۱	ملک الشعرا شیخ غلام قادر گرامیؔ	۲۹
۲	میاں محمد شاہدین ہمایوںؔ	۳۳
۳	خان احمد حسین خاں احمدؔ	۳۹
۴	مولانا ظفر علی خاں	۴۴
۵	ڈاکٹر شیخ سر محمد اقبالؔ	۵۲
۶	تلوک چند محرومؔ	۶۵
۷	میاں بشیر احمد زارؔ	۸۳
۸	مولانا عبدالمجید سالکؔ	۹۰
۹	منشی محمد ظہور ناصرؔ	۹۹
۱۰	مولانا غلام رسول مہرؔ	۱۰۳
۱۱	شیخ عبداللطیف تپشؔ	۱۰۹
۱۲	میاں محمد یوسف یوسفؔ	۱۱۶
۱۳	خان صاحب ابوالاثر حفیظ جالندھری	۱۲۶
۱۴	صوفی غلام مصطفےٰ تبسمؔ	۱۴۲

شمار	نام	صفحہ
۱۵	منصور احمد ندیم	۱۵۳
۱۶	حامد علی خاں حامد	۱۶۳
۱۷	خواجہ عبدالسمیع اثر صہبائی	۱۷۳
۱۸	ڈاکٹر محمد دین تاثیر	۱۸۲
۱۹	چراغ حسن حسرت کاشمیری	۱۹۹
۲۰	کاظم علی وقار انبالوی	۲۰۷
۲۱	جلال الدین اکبر	۲۲۱
۲۲	سید عابد علی عابد	۲۳۳
۲۳	میاں مولا بخش خضر	۲۴۹
۲۴	خواجہ عبدالحمید حمید عرفانی	۲۶۱
۲۵	سید عبدالحمید عدم	۲۶۹
۲۶	نذر محمد راشد	۲۷۷
۲۷	عبدالحفیظ سلیم حفیظ ہوشیارپوری	۲۸۳
۲۸	ملک عطاءاللہ کلیم	۲۹۱
۲۹	مہر لال ضیا	۲۹۷

گرامی

(سنہ ۱۸۵۶ء.........سنہ ۱۹۲۷ء)

ملک الشعراء شیخ غلام قادر صاحب گرامی جالندھر میں پیدا ہوئے۔ آپکے والد کا نام شیخ سکندر بخش تھا۔ جو ککے زئی قوم کے ایک بزرگ تھے۔ اور انکے ہاں نیل کی رنگائی کا کام ہوتا تھا۔ گرامی مرحوم ابتداءً ایک مسجد میں مذہبی تعلیم کے اکتساب میں مصروف رہے۔ بعد ازاں خلیفہ ابراہیم صاحب کے مکتب میں داخل ہوئے۔ خلیفہ صاحب ایک خدا شناس بزرگ تھے جن سے حضرت گرامی نے فارسی کی ابتدائی درسی کتابیں گلستاں۔ سکندر نامہ وغیرہ پڑھیں۔ چونکہ بچپن سے ہی تحصیل تعلیم کا شوق بہت زیادہ تھا۔ اس لئے جب جوان ہوئے۔ تو جالندھر سے لاہور پہنچکر اورنٹیل کالج میں داخل ہوگئے جہاں سے آپ نے منشی فاضل کا امتحان پاس کرلیا۔ بعد ازاں وکالت کا امتحان بھی دیا۔ جس میں آپ کامیاب ہوگئے۔ تعلیم سے فارغ ہوکر آپ جالندھر لوٹ آئے۔ اور تھوڑے دنوں کے بعد امرتسر کے ایک اسکول میں فارسی کے مدرس

ہو گئے۔ کچھ مدت بعد یہ ملازمت ترک کر کے کپور تھلہ میں کچھ عرصہ تک قیام کیا۔ جہاں سے لدھیانہ کے ہائی اسکول میں فارسی کے مدرس مقرر ہو کر چلے آتے۔ اُن دنوں لدھیانہ میں بارٹن صاحب سپرنٹنڈنٹ پولیس تھے۔ اُن کو فارسی کا بہت شوق تھا۔ اور وہ اکثر مولانا کو بلا کر اُن سے فارسی اشعار سنا کرتے۔ اُنہوں نے جب مولانا کا دل اسکول سے اچاٹ دیکھا۔ تو انہیں ترغیب دی۔ کہ وہ پولیس میں ملازم ہو جائیں۔ مولانا اِس محکمہ کی ملازمت کو پسند نہیں کرتے تھے۔ مگر بارٹن صاحب کی ترغیب اور اصرار پر وہ اس تجویز سے متفق ہو گئے۔ کچھ عرصہ تک کام کیا۔ مگر جب جی اُکتا گیا۔ تو اِس ملازمت سے سبکدوش ہو گئے۔ اس کے بعد آپ کافی عرصہ تک ملازمت کے سلسلہ میں مختلف مقامات مثلاً پٹیالہ۔ رام پور۔ مالیر کوٹلہ وغیرہ میں پھرتے پھراتے رہے۔ مگر کسی جگہ چین سے بیٹھنا گوارا نہ ہوا۔

ایک دفعہ مولینا پٹیالہ تشریف لے گئے۔ وہاں خلیفہ محمد حسنین صاحب مرحوم وزیراعظم کے ہاں ٹھہرے۔ جب انہوں نے آپ کا کلام سُنا تو آپ کو یہ مشورہ دیا۔ کہ وہ دکن چلے جائیں۔ چنانچہ انہوں نے رزیڈنٹ کے ایک دوست سے اُنکی طرف تعارفی خط بھی لکھوا دیا۔ مولینا نے دکن پہنچکر رزیڈنٹ صاحب کو خط دیا۔ وہ بہت تپاک سے پیش آئے۔ اور آپ کی بہت جلد میر محبوب علی خان غفران پناہ کے دربار

میں رسائی ہو گئی۔ آپ نے ایک قصیدہ لکھا جس کے صلہ میں آپ کو قدر بلگرامی مرحوم کی جگہ شاعرِ خاص مقرر کیا گیا۔ اور چند سال کے بعد ملک الشعراء کا خطاب دیا گیا۔

آپ نے تقریباً پینتیس ۳۵ سال دکن میں گذارے۔ ۱۹۱۶ء میں دکن سے ذیابیطس سے بیمار ہو کر پنجاب میں آئے۔ تو ایک عرصہ تک علالت کی وجہ سے قیام کیا۔ ۱۹۲۰ء میں مرض زیادہ بڑھ گیا۔ علاج سے کوئی افاقہ نہ ہوا۔ اور آخر کار ۲۶ رمئی ۱۹۲۷ء بروز پنجشنبہ ۳ بجے صبح داعئی اجل کو لبیک کہا۔

گرامی مرحوم نے زیادہ کلام فارسی میں کہا ہے۔ اردو میں گاہے گاہے شاگردوں کے اصرار پر لکھا ہے۔ کیونکہ کہا کرتے تھے کہ "غالب۔ میر۔ انیس۔ آتش اور مومن کے ہوتے ہوئے اردو میں لکھنا جھک مارنا ہے" آپ نے فارسی میں دو مثنویاں شروع کی تھیں جو غالباً پایۂ تکمیل تک نہ پہنچ سکیں۔ آپ کے تلامذہ میں سے مشہور عصر شعراء علامہ اقبال، مولانا حفیظ جالندھری اور حضرت عظامی ہیں۔

تصنیفات

۱۔ **دیوانِ گرامی :-** آپ کی وفات کے بعد آپ کے فارسی کلام کا مجموعہ یک جا کر کے شائع کیا گیا ہے۔

۲۔ رُباعیاتِ گرامی :۔ فارسی کی رباعیات کا مجموعہ ہے۔

انتخابِ کلام

چونکہ آپ کا اردو کا کلام بہت کم شائع ہوا ہے۔ اس لئے مجھے جو کچھ جستجو کے بعد میسّر ہو سکا ہے۔ وہ پیش کیا جاتا ہے :۔

نہ وہ دل رہا نہ وہ آرزو یہ کشش ہے کیا ترے ناز میں
اِسے کون کہتا ہے بُت شکن وُہ جو دل ہے لُطفِ ایاز میں
مری زندگی مری موت ہے، مری موت ہے مری زندگی
مرا جسم ظُلمتِ ہند میں مری رُوح خاکِ حجاز میں



آنریبل میاں محمد شاہ دین صاحب (ہمایوں)

ہمایوں

(۱۸۶۸ء .... ۱۹۱۸ء)

میاں محمد شاہ دین صاحب ہمایوں مرحوم ۲ اپریل ۱۸۶۸ء کو باغبانپورہ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد مولوی نظام الدین مرحوم ایک فاضل بزرگ تھے۔ اور آپ کے دادا مولوی قادر بخش صاحب فارسی اور عربی کے جیّد عالم تھے۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے عہد میں آپ شاہی خاندان کے نوجوانوں کی اتالیقی پر مامور تھے۔ طبیعت شعر و سخن کے لئے نہایت موزوں پائی تھی۔ اور نادر تخلص کرتے تھے۔ لیکن مقام افسوس ہے۔ کہ اُن کے کلام کا مجموعہ ضائع ہو گیا ہے۔

ہمایوں مرحوم کی ابتدائی تعلیم باغبانپورہ میں ہوئی۔ چھ برس کی عمر میں کلام مجید ختم کیا۔ مڈل کے امتحان میں اوّل رہے۔ اور انٹرنس میں پنجاب بھر میں انگریزی میں اوّل تھے۔ بی۔ اے کا امتحان لاہور میں امتیازی حیثیت سے پاس کیا۔ اور ۱۸۸۸ء میں انگلستان تحصیل تعلیم کی غرض سے چلے گئے۔ قابلیت خداداد تھی

جب انگلستان سے بیرسٹر ہو کر واپس آئے۔ تو اپنی انگریزی اور اردو کی تقریروں کے لئے اہلِ ملک سے خراجِ تحسین وصول کیا۔ بعد میں پنجاب کی مجلس وضع قوانین کے رُکن نامزد ہوئے۔ اور پھر عدالت عالیہ میں جج مقرر ہوئے۔ جہاں وہ عارضی طور پر چیف جج کے عہدۂ جلیلہ تک پہنچے۔

آپ کی زندگی ہمہ تن عمل اور اصلاحِ قوم میں صرف ہو گئی۔ سرسیّد مرحوم نے علیگڈھ کالج کی بنیاد ڈالی۔ تو آپ نے اس میں سرگرمی سے حصّہ لیا۔ لاہور میں اصلاحی مشاعرے شروع ہوئے۔ تو آپ ان میں شریک ہوئے۔ مطالعہ واحد شغل تھا جس میں آخر عمر تک انہماک رہا۔ اپنی موت سے ۲۶ دن پیشتر چیف کورٹ میں کام پر گئے۔ آپکی یہ خواہش تھی۔ کہ کام کرتے کرتے ہی جان دے دیں۔ چنانچہ یہی ہوا۔ اور آپ نے ۲ر جولائی ۱۹۱۷ء کو داعیٔ اجل کو لبیک کہی۔ علامہ سر اقبالؔ نے مرحوم کی تاریخ وفات لکھی ہے:۔

در گلستانِ دہر ہمایونِ نکتہ سنج — آمد مثالِ شبنم و چوں بوئے گل رمید
می جست عندلیبِ خوش آہنگ سالِ فوت — علاّمۂ فصیح ز ہر چار سُو شنید

۱۳۳۶ھ ۳۳۴ ۴

شاعری کا شوق بچپن سے تھا۔ انگلستان جانے سے قبل عشقیہ غزلیات

لکھیں لیکن انگلستان سے واپس آنے سے پر رجحان بالکل تبدیل ہوگیا۔ یہانتک کہ جوانی کا مجموعۂ کلام ضائع کر دیا۔ بعد میں جو کچھ لکھا۔ وہ صرف دیانتداری سے اپنے خیالات کو بیان کرنے کے لئے۔ لیکن رسمی شاعری کی غرض سے نہیں۔

تصنیف

۱۔ جذبات ہمایوں ۔ ہمایوں مرحوم کی اپنی مستقل تصنیف تو کوئی نہیں۔ صرف اُن کی وفات کے بعد اِس نام سے آپکے صاحبزادہ میاں بشیر احمد صاحب نے آپ کی چند نظموں کو جمع کر دیا ہے۔

انتخابِ کلام

شعرائے قوم سے خطاب

اے شاعرانِ قوم زمانہ بدل گیا ۔ پر مثلِ زلفِ یار تمہارا نہ بل گیا
پیٹو گے کب تلک سرِ رہ تم لکیر کو ۔ بجلی کی طرح سانپ تڑپ کر نکل گیا

. . . .

اٹھو وگرنہ حشر نہیں ہوگا کبھی ۔۔۔ دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا
اک تم کہ جم گئے ہو جمادات کی طرح ۔۔۔ اِک وہ کہ گویا تیر کماں سے نکل گیا

ہاں ہاں سنبھالو قوم کو شاید سنبھل ہی جائے
گر گر کے مُلکِ ہند کچھ آخر سنبھل گیا

یہ کس کے سوز کا ہے بزمِ جاں میں انتظار اے دل
کہ آہیں آج سوئے عالمِ بالا نہیں جاتیں
اُمیدیں جب میری بر آئیں تو ہنس کر لگے کہنے
یہ برسوں قیدِ دل میں رہ کے کیوں گھبرا نہیں جاتیں
نہیں گستاخ آئینہ۔ مقابل ہے کھڑا کوئی
یہ حیراں ہے کہ کیوں آنکھیں تری شرما نہیں جاتیں

رہے گا کب تلک تو محوِ دیدارِ رُخِ انور ۔۔۔ مجھے دم بھر قدم اُنکے دلِ بیتاب لینے دے

جُدا ہونے کو تھی مقتل میں جب وہ جانِ بسمل سے ۔۔۔ ہماری حسرتیں رُوئیں لپٹ کر تیغِ قاتل سے

ملتا نہیں خزاں میں گُلِ لالہ نام کو   وہ آئیے دیکھنے مرے داغِ الم کو آج

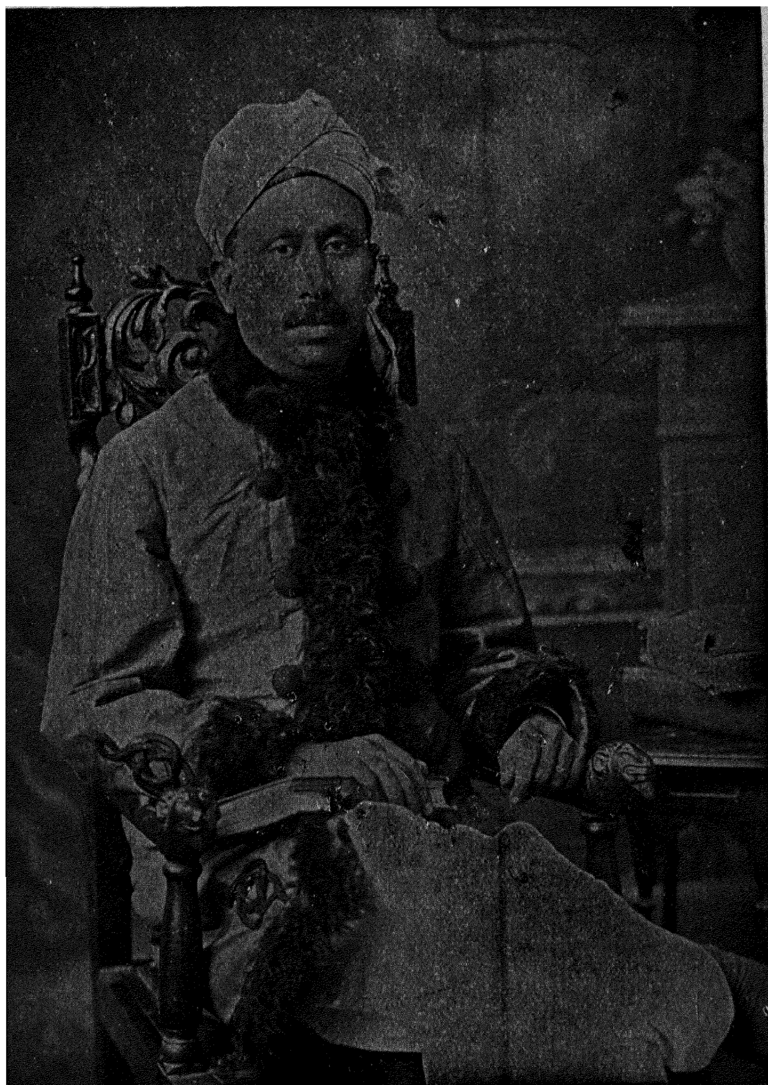
وادئ سندھ

سندھ کی وادی پہ ہے کالی گھٹا چھائی ہوئی
برقعہ اوڑھے اِک دلہن بیٹھی ہے شرمائی ہوئی
منتظر بارش کے ہیں مکی کے اور شالی کے کھیت
تشنگی سے خوشہ کی صورت ہے مرجھائی ہوئی
آج گاندربل ہؤا ہے اس کا منظورِ نظر
اِس کے سر پر کیا گھٹا پھرتی ہے منڈلائی ہوئی
سندھ کے نالے کی آہوں کا دھواں شاید اُٹھا
کیسی تاریکی ہے سطحِ آب پر چھائی ہوئی
قاصدِ ابر آرہا ہے لیکے ہاں پیغامِ فیض
بارگاہِ ایزدی میں کس کی شنوائی ہوئی
سوئے مشرق ہے سرِ کہسار پر بارش کا زور

رحمتِ باری ہے گویا جوش پر آئی ہوئی

. . . .

اے ہمایوں فیضِ بارش سے کھلے ڈل کے کنول
کیوں ترے دل کی کلی ہے آج مرجھائی ہوئی



خان احمد حسین خان

احمد

(۱۸۶۹ء ـــــــــ)

خان احمد حسین خاں صاحب بی۔اے، ام۔آر۔اے۔ایس خان بہادر ڈاکٹر محمد حسین خاں صاحب مرحوم آنریری مجسٹریٹ لاہور و بانی میڈیکل کالج لاہور کے فرزند اکبر ہیں۔ لاہور میں ۱۸۶۹ء میں پیدا ہوئے اور یہیں سے بی۔اے کرنے کے بعد آپ محکمہ سول میں ملازم ہوئے اور ایک عرصہ تک سب جج رہنے کے بعد ریٹائر ہوئے پنشن پانے کے بعد آپ نے رسالہ "شباب اُردو" جاری کیا۔ جو تاہنوز لاہور سے آپ کی ادارت میں شائع ہو رہا ہے۔

خان صاحب موصوف نہایت ملنسار اور مخلص بزرگ ہیں۔ افسانہ نویسی میں آپ کو کمال حاصل ہے۔ بے تکان لکھتے چلے جاتے ہیں۔ اس وقت تک ہزارہا افسانے آپ لکھ چکے ہوں گے۔ کئی ایک تصانیف پر حکومت کی طرف سے انعام بھی مل چکا ہے شیکسپیئر کے کئی ایک ڈراموں کا کامیاب ترجمہ بھی

کیا ہے۔ آپکی تصنیفات کی تعداد ڈیڑھ سو کے قریب ہے، بیشتر کئی مرتبہ شائع ہوئی ہیں شعرگوئی کا ذوق نہایت شستہ ہے مغلق اور مشکل الفاظ سے پرہیز کرتے ہیں۔ اس لئے آپ کا بیشتر کلام سہل ممتنع کی حیثیت رکھتا ہے۔

تصنیفات و تالیفات

۱۔ **سیرۃ احمدی**۔ اردو میں حضرت محمدؐ صلعم کی سوانحعمری مختصر طور پر لکھی گئی ہے۔

۲۔ **نظیر بیگم**۔ ۳۔ **سوز**۔ ۴۔ **حسرت**
۵۔ **گیتی آرا**۔ ۶۔ **آہ**۔ ۷۔ **آپ بیتی** } مختصر سے ناول ہیں

۷۔ **لالہ زار**۔ آپ کے افسانوں کا مجموعہ ہے۔

۸۔ **آبِ بقا**۔ آپ کے کلام کا مجموعہ ہے۔

انتخاب کلام

داغِ دل مہرِ محبت ہے چھپا رکھا ہے — عاقبت کے لئے کچھ ہم نے بچا رکھا ہے

سوز کو شمع نے چھاتی پہ لٹا رکھا ہے — دردِ دل ہم نے کلیجے سے لگا رکھا ہے

بخدا آنکھوں سے آنکھوں میں بٹھا رکھا ہے
سات پردوں میں اُسے ہم نے چھپا رکھا ہے

واقعی شمع کا جادو ہے ادا سے رونا
کیسا پروانوں کو دیوانہ بنا رکھا ہے

کونسے منہ سے کریں شکر خدا کا اُس نے
اپنے بندوں سے وہ کیا ہے جو اُٹھا رکھا ہے

شائد اس چرخِ ستمگار کی دیکھا دیکھی
ظلم دُنیا میں حسینوں نے روا رکھا ہے

چھوٹ جائے نہ کہیں شمع کا بھانڈا ہم نے
شعلۂ آہ کو سینے میں دبا رکھا ہے

میری عادت میری خصلت میری خُو بُو ہو گی
نام جس چیز کا لوگوں نے وفا رکھا ہے

رشکِ فردوس ہر وہ گھر کہ خوشی ہو جس میں
ہم نہیں جانتے فردوس میں کیا رکھا ہے

بارہا دیکھا ہے بن مانگے ملے ہیں موتی
پھر دعاؤں میں بتا دے کوئی کیا رکھا ہے

میرا اقسامِ ازل کتنا ہے انصاف پسند
رزق ہر ایک کے حِصّے کا جُدا رکھا ہے

زخمِ دل کیا ہے کسی اہلِ وفا سے پُوچھو
گھر میں اللہ کے سونے کا دیا رکھا ہے

لوگ ہنستے ہیں کہ کس برتے پہ تتا پانی
گل یہ کیا شمعِ سحر تو نے کھلا رکھا ہے

داورِ حشر نہیں تابِ تکلم مجھ کو
جامِ توحید نے متوالا بنا رکھا ہے

ہم کو معلوم ہے اس دل کی حقیقت احمدؔ
اک گھروندا سا محبت نے بنا رکھا ہے

آئینہ

نور بافِ صنعتِ اربابِ فن ہے آئینہ
موشگافِ کسوتِ صبحِ وطن ہے آئینہ

بیضہ آرائے یدِ اعجازِ پیغمبر ہے یہ
آبروئے شوکتِ دورانِ اسکندر ہے یہ

آبِ زمزم میں ہے پرتو نرگسِ مخمور کا
جس کا منہ تکتا ہے حلقہ جوہرِ ساطور کا

پہلوئے انساں میں لیکن عجب ہے آئینہ
باعثِ اُلفت محبت کا سبب ہے آئینہ

یہ انوکھا آئینہ گو سانولا پر صاف ہے
یہ نرالا آئینہ سودائی پر شفاف ہے

خون بنکر پہلوئے مضطر میں رہ جاتا ہے یہ
بن کے آنسو دیدۂ گریاں سے بہ جاتا ہے یہ

فرقت کی رات

یہ شبِ فرقت بھی کیسی رات ہے
ایک میں ہوں اور خدا کی ذات ہے

کس قدر تاریک ہے اندھیر ہے
رات ہے یا پردۂ ظلمات ہے

ہائے میری نیند کو کیا ہو گیا
کالے کوسوں پر گئی ہیہات ہے

دردِ دل میں اور کلیجے میں جلن
اور وحشت مجھ کو ساری رات ہے

تے اشکوں کی نہیں تھمتی جھڑی   میری آنکھوں میں چھپی برسات ہے
ئے کب اس رات کی ہوگی سحر   یہ عذابِ نزع ہے یا رات ہے

ہُو کا عالم اور اُداسی چارسُو
اس پہ طرّہ یہ کہ کالی رات ہے

ظفر علی خاں

(۱۸۷۰ء ———————)

مولانا ظفر علی خاں ۱۲۹۰ھ میں کوٹ میر میں پیدا ہوئے۔ سن پیدائش نام سے نکلتا ہے۔ کرم آباد تحصیل وزیر آباد (پنجاب) کے رہنے والے ہیں۔ آپ کے والد بہت بڑے زمیندار تھے۔ مگر اس وقت کچھ مکانات اور تھوڑی سی زمین کے سوا باقی جائداد سیاسی سرگرمیوں کی نذر ہو چکی ہے۔ ابتدائی تعلیم آپ نے وزیر آباد اور پٹیالہ میں حاصل کی۔ پھر علیگڈھ کالج سے بی۔ اے پاس کر کے بمبئی چلے گئے۔ جہاں پر نواب محسن الملک مرحوم کے ساتھ معتمد خصوصی کی حیثیت سے ایک سال تک کام کرتے رہے۔ معرکۂ مذہب و سائنس اُسی زمانہ میں ترجمہ کی۔ اتفاق سے مولانا شبلی نعمانی بمبئی گئے۔ تو ان سے حیدر آباد (دکن) کے حالات سنے۔ اور وہیں کی ٹھان لی۔ چنانچہ مولوی مرزا عزیز دہلوی کی وساطت سے ہوم آفس میں مترجم ہو گئے۔ رفتہ رفتہ ترقی کر کے لیجسلیٹو کونسل کے مستقل رجسٹرار قرار پائے۔ ان دنوں مرزا داغ مرحوم حیدر آباد میں

بہت عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ اُن کے حلقۂ تلمذ میں شامل ہوئے۔
اور اصلاح لیتے رہے۔ حیدرآباد میں انگریزی مضمون نگاری کا شوق پیدا ہوا۔ تو بمبئی
گزٹ اور ٹائمز آف انڈیا میں معرکتہ الآرا مضامین لکھے۔ کہ ملک میں دھوم مچ گئی۔
مگر آپ کا حریت پرور دل آپ کو کشاں کشاں ایک مستقل شاہراہ پر لے آیا۔
یعنی اُنہوں نے والد کی فوتیدگی پر اخبار "زمیندار" کو سنبھال لیا۔ جو پنجاب کے دارالخلافہ
لاہور سے روزانہ شائع ہوتا ہے۔ اُس وقت سے مستقل شغل اخبار نویسی ہو گیا ہے۔
آپ ایک کامیاب ادیب ہیں۔ شعر گوئی ابتدائے سن تمیز سے شروع کی ہے
آپ کی نظم میں مذہبی اور سیاسی عنصر غالب ہوتا ہے۔ ہنگامی نظمیں لکھنے میں آپ کو
ید طولیٰ حاصل ہے۔ قلیل سے قلیل وقت میں کئی کئی سو شعر کہہ جاتے ہیں۔
طبیعت میں فراخدلی صانع ازل نے بدرجہ غایت ودیعت کی ہے لیکن چونکہ
ہر کہ ومہ کے مشورہ کو وقعت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اس لئے ہنگامی جذبات سے
اکثر متاثر ہو جاتے ہیں۔ اور ہر ایک موقعہ پر اپنی رائے کا اظہار آزادی سے کرتے
ہیں۔ اسی لئے آج تک کسی سیاسی یا مذہبی جماعت سے مستقل طور پر تعلق قائم نہیں رکھا
لیکن آپ کی حسن نیت کا اثر ہے۔ کہ "زمیندار" ہندوستان کے مسلمانوں کی اعانت
سے بیش از بیش مالی قربانی کر کے بھی شائع ہو رہا ہے۔

تصنیفات وتراجم

۱۔ جسیات ۔ آپ کے اُس کلام کا مجموعہ ہے۔ جو آپ نے قیدِ فرنگ کے دوران میں کہا ہے۔

۲۔ جنگِ روس وجاپان ۔ ایک پُرلطف ڈرامہ ہے۔

۳۔ سنہرا گھونگا۔ }
۴۔ میری عینک } انگریزی کے دو مختصر افسانوں کے ترجمے ہیں۔

۵۔ معرکۂ مذہب وسائنس :۔ انگریزی کی ایک مشہور تصنیف کا ترجمہ ہے اس کتاب کے لئے آپ کو سرکارِ انگلشیہ سے انعام عطا ہوا۔

۶۔ بہارستان :۔ آپ کے مجموعہ کلام کا نام ہے۔ یہ مجموعہ آپ کے ۲۵ سال کے کلام کا ذخیرہ ہے۔ اِس کی پہلی اشاعت کے بعد مولانا کو یہ علم ہوا۔ کہ اِس میں بہت سے اغلاط ہیں۔ اس لئے اسے کنارِ راوی نذرِ آتش کر دیا گیا تین سال کے بعد یہی مجموعۂ کلام تصحیح کے بعد لاہور سے دوبارہ شائع ہوا ہے۔

انتخاب کلام

شمعِ ھدایت

وہ شمع اُجالا جس نے کیا چالیس برس تک غاروں میں
اِک روز چمکنے والی تھی سب دنیا کے درباروں میں
گر ارض وسما کی محفل میں لَوْلَاکَ لَمَا کا شور نہ ہو
یہ رنگ نہ ہو گلزاروں میں یہ نور نہ ہو سیاروں میں
جو فلسفیوں سے کُھل نہ سکا اور نکتہ وروں سے حل نہ ہُوا
وہ راز اِک کملی والے نے بتلا دیا چند اشاروں میں

وہ جنس نہیں ایمان جسے لے آئیں دکاں سے مول جسے
ڈھونڈھے سے ملے گی عاقل کو یہ قرآں کے سیپاروں میں

بارش

ابر تھا چھایا ہوا اور فصل تھی برسات کی
تھی زباں پہنے ہوئے وردی ہری بانات کی

آفتاب اوڑھے ہوئے تھا چادرِ ابرِ سیاہ
برق کی چشمک زنی سے خیرہ ہوتی تھی نگاہ

بادل اتنے میں دُرِ ناسفتہ برسانے لگے
داستانِ قُلزم و عمّان دُہرانے لگے

بادلوں سے نورِ خورشید اس طرف چھننے لگا
سائباں قوسِ قزح کا اس طرف تننے لگا

جنگلوں میں مست ہو کر ناچتے پھرتے تھے مور
کوہساروں میں چکوروں نے مچا رکھا تھا شور

یہ نظر آرا مناظر تھے کچھ ایسے دلفریب
ہاتھ سے جاتا رہا دل میرے اور دل سے شکیب

لندن

لیلیٰ شب نے مانگ سنواری
آدھی عمر اسی میں گذاری

بجتے ہیں پہلے بارہ ٹن ٹن
پھر بجتا ہے گجر کا ارگن

چاند کی پیلی پیلی کرنیں
پیاری چھیل چھبیلی کرنیں

سقفِ فلک پر ناچیں چھم چھم
صحنِ زمیں پر اتریں جھم جھم

پگھلی ہوئی چاندی کا سمندر — بہنے لگا باہر اور اندر
جس نے ملمع اپنا چڑھایا — اور پلٹی اُس شہر کی کایا
جو ہے غداری میں بابل — کہتے ہیں سب ملکوں کا جسے دل
یعنی عروسِ دنیا لندن — شاہد دلکش و زیبا لندن

اے دنیا کے شہروں کے افسر — سب سے افضل سب سے برتر
حشمت والے دولت والے — نشۂ دولت کے متوالے
صنعت اور تجارت والے — دولت اور حکومت والے
ہنڈیوں والے نوٹوں والے — فائدوں والے ٹوٹوں والے
وِسکی والے اکشا والے — لمنیڈ والے سوڈا والے
توپوں اور بندوقوں والے — عاشقوں اور معشوقوں والے
پیاری پیاری جبینوں والے — اُبھرے اُبھرے سینوں والے
چوری کرنے والوں والے — جیب کترنے والوں والے
لقوں والے لچوں والے — شہدوں اور اچکوں والے
کیسے کیسے گناہ اور بدیاں — ہیں ترے دل کے اندر پنہاں

ربِ کعبہ سے ایک عاجزانہ التجا

کوڑی کے تین تین بکیں گے یہ مولوی
اُٹھا ٹھکے لے رہے ہیں جو تثلیث کے قدم

کسکو اِس ابتلا کی خبر تھی کہ ایک دن
ہم پر ہمارے ہی علماء ڈھائیں گے ستم

دارالاماں کے سر پہ قیامت گذر گئی
تہ خدا کے پھٹنے لگے آسماں سے بم

وہ گردنیں جو غیر کے آگے جھکی نہ تھیں
آج اس کے آستاں پہ نظر آرہی ہیں خم

اے ربِ کعبہ ہم سے کہاں تک یہ برہمی
کیوں ہوگئی نری نگہِ التفات کم

کب تک رہینگے دست و گریباں فرنگ سے
کبتک لڑا کریں گے یہ کشتی قضا سے ہم

تندھار کو وہ زور عطا کر کہ عنقریب
کابل میں پھر بلند ہو توحید کا علم

مضٰے ما مضٰے

کچھ آج اپنی مصیبت کا ماجرا کہئے
مگر جو کہئے وہ سچ کہئے اور بجا کہئے

ہر اک جفا کی حقیقت الگ الگ لکھئے
ہر ایک ظلم کا قصّہ جُدا جُدا کہئے

کبھی خود اپنے چلن کی برائیاں گنئے
اور اُس کو اپنی خرابی کی ابتدا کہئے

کبھی عدو کی روش کی شکایتیں کیجئے
اور اس کو اپنی تباہی کی انتہا کہئے

درازیٔ شب فرقت کی داستاں میں اگر
کمی رہی ہو تو کوتاہیٔ قضا کہئے

یہ کیا غضب ہے کہ گھر کو لگا کے آپ ہی آگ
پھر اس کو شومیٔ تقدیر نارسا کہئے

ہماری تیغ ہمارے ہی خوں میں پیر گئی
اسے بھی شوق سے قاتل کی اک ادا کہئے

برسم مومنِ قانت شب بلا سر سے
جو ٹل گئی تو مضائقہ کے ما مضیٰ کہئے

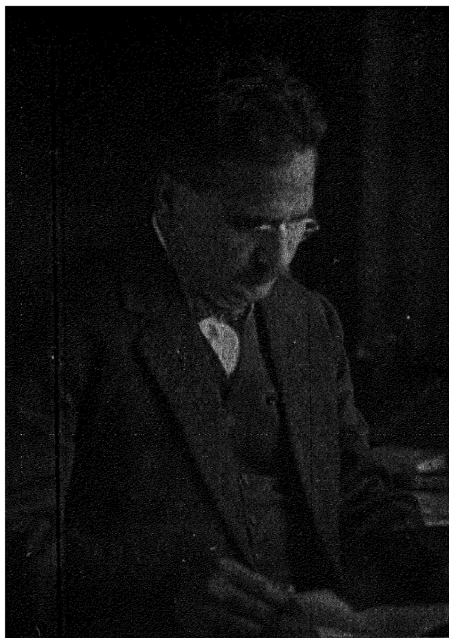
نہیں رہا در اندازیٔ رقیب کا خوف
اب اٹھ کے بزم میں جو کہئے برملا کہئے

بقولِ غالبؔ اگر پار اتر گئی کشتی
خدا اسے کیا ستم و جورِ ناخدا کہئے

اقبالؔ

(۱۸۷۶ء ـــــــــ)

ڈاکٹر شیخ سر محمد اقبال کو کشمیری پنڈتوں کے ایک قدیم خاندان سے تعلق ہے جس کی ایک شاخ اب تک کشمیر میں موجود ہے۔ آپ کی ولادت ۱۸۷۶ء میں بمقام سیالکوٹ ہوئی۔ ابتدائی تعلیم وہیں کے سکولوں میں ہوئی۔ بلکہ انٹرمیڈیٹ کا امتحان بھی وہیں مرے کالج سے پاس کیا۔ اِس دوران میں سید میر حسن مرحوم کے فیضانِ صحبت سے آپ کی خداداد ذہانت کی تربیت احسن اسلوب پر ہوئی۔ سیالکوٹ سے فارغ ہونے پر آپ گورنمنٹ کالج، لاہور میں داخل ہوئے۔ جہاں سے آپ نے امتیازی حیثیت سے بی۔ اے کا امتحان پاس کیا۔ اور تمغے حاصل کیے۔ انہی ایام میں پروفیسر آرنلڈ علیگڈھ سے گورنمنٹ کالج، لاہور میں چلے آئے تھے۔ آپ نے اقبالؔ کی نکتہ رس طبیعت کو دیکھا اور اُن کی ذہنی ترقی میں مدد دینے کے لئے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔ یہاں تک کہ اقبالؔ کو شاگرد کی بجائے



اقبال

اپنا دوست سمجھنے لگے۔

ایم۔اے پاس کرنے کے بعد آپ اورنٹیل کالج، لاہور میں تاریخ فلسفہ، اور سیاست مدن پر لیکچر دینے کے لئے مقرر کئے گئے۔ پھر گورنمنٹ کالج، لاہور میں فلسفہ کے پروفیسر ہوکر چلے گئے لیکن ابھی تک اکتساب علم کے شوق کی تسکین نہ ہوئی تھی۔ اس لئے ۱۹۰۵ء میں آپ یورپ تحصیل علم کی غرض سے چلے گئے۔ اور وہاں پی۔ایچ۔ڈی کے علاوہ بیرسٹری کا امتحان پاس کیا۔ تین سال کے مختصر سے قیام کے بعد آپ لاہور تشریف لائے۔ اس کے بعد آپ کا مستقل شغل وکالت رہا ہے لیکن اس شغل میں کوئی اتنی کوشش اور دلچسپی سے حصہ نہیں لیا۔ ۱۹۲۲ء میں حکومتِ پنجاب کی طرف سے آپ کو ادبی خدمات کے صلہ میں سَر کا خطاب عطا ہؤا۔

علامہ اقبال ابتدائے سن تمیز سے ہی شاعری کی طرف مائل تھے۔ قدرت نے نہایت صحیح اور شستہ مذاق ودیعت کیا تھا۔ اسپر کثرتِ مطالعہ اور مختلف علوم سے آگاہی نے شاعری کی تکمیل کرنے میں مدد دی۔ خصوصاً آپ نے اِسلامی علوم اور اسلامی فلسفہ سے اِس قدر استفادہ کیا ہے کہ آپ کی تصنیفات اسلامی رموز و حقائق کا کامیاب مجموعہ بن گئی ہیں۔ شبلی مرحوم فرمایا کرتے تھے "جب آزاد اور حالی

کی کرسیاں خالی ہوں گی ۔ تو لوگ اقبال کو ڈھونڈیں گے۔"

طبیعت میں انتہائی درجہ کی سادگی ہے لیکن ملاقی ایک نظر میں ہی یہ محسوس کرنے لگتا ہے۔ کہ یہ بوریا نشین انتہائی ذہنی بلندیوں کا مالک ہے۔

تصنیفات

۱۔ بانگِ درا۔ اردو میں آپ کے ابتدائی کلام کا مجموعہ ہے جسمیں "شمع و شاعر" "شکوہ" اور "جواب شکوہ" جیسی مشہورِ عالم اور طویل نظمیں شامل ہیں۔

۲۔ کلیاتِ اقبال۔ آپ کے بہت سے ناپید اور مطبوعہ اردو کلام کا مجموعہ ہے۔ جو حیدر آباد سے شائع ہوا تھا لیکن کسی مصلحت کی وجہ سے اسکی فروخت پنجاب میں علامہ سر اقبال نے ممنوع قرار دی تھی۔

۳۔ پیامِ مشرق۔ فارسی میں شاعرِ المانوی گوئٹے کے جواب میں آپ نے مغرب کو پیامِ مشرق پیش کیا ہے۔

۴۔ رموز و اسرار۔ فلسفیانہ رنگ میں فارسی میں دو مثنویاں لکھی گئی ہیں۔ جن میں اسلامی فلسفہ اور اسلامی عقائد کی توضیح کی گئی ہے۔

۵۔ زبورِ عجم۔ آپ کے فارسی کلام کا مجموعہ ہے۔

۶۔ خطباتِ مدراس۔ مذہب اسلام اور اسلامی فلسفہ کے متعلق انگریزی کے اُن خطبات کا مجموعہ ہے۔ جو آپ نے مدراس میں پڑھے ہیں۔

۷۔ جاوید نامہ۔ فارسی میں ایک مسلسل اور طویل نظم ہے جس میں علامہ موصوف نے اپنے فلسفہ کی وضاحت پیر رومی کی معیت میں مختلف افلاک کی سیر کرتے ہوئے کی ہے۔

۸۔ مسافر۔ افغانستان کا سفر کرنے کے بعد فارسی میں چند نظمیں لکھی گئی ہیں۔

۹۔ بالِ جبریل۔ آپ کے اُس اُردو کلام کا مجموعہ ہے۔ جو بانگِ درا کے بعد آپ نے لکھا ہے۔

۱۰۔ ضربِ کلیم۔ دورِ حاضر کے خلاف اردو میں آپ کی نظموں کا مجموعہ ہے۔ جو ۱۹۳۶ء میں پہلی دفعہ شائع ہوا تھا۔

۱۱۔ پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق۔ فارسی مثنوی ہے۔

انتخابِ کلام

واعظ کمالِ ترک سے ملتی ہے یاں مراد ‏ ‏ دُنیا جو چھوڑ دی ہے تو عقبیٰ بھی چھوڑ دے

اچھا ہے دل کے پاس رہے پاسبانِ عقل
لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

جینا وہ کیا جو ہو نفسِ غیر پر مدار
شہرت کی زندگی کا بھروسا بھی چھوڑ دے

سوداگری نہیں یہ عبادت خدا کی ہے
او بے خبر جزا کی تمنا بھی چھوڑ دے

پیغامِ سروش

تمدن، تصوف، شریعت، کلام
بتانِ عجم کے پجاری تمام

طلسمِ معانی ۔ بیانِ خطیب
مگر لذتِ شوق سے بے نصیب

حقیقت روایات میں کھو گئی
یہ اُمت خرافات میں کھو گئی

بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے
مسلماں نہیں راکھ کا ڈھیر ہے

زندگی

اُتر کر جہانِ مکافات میں
رہی زندگی موت کی گھات میں

مذاقِ دوئی سے بنی زوج زوج
اُٹھی دشت و کہسار سے فوج فوج

گل اس شاخ سے ٹوٹتے بھی رہے اسی شاخ سے پھوٹتے بھی رہے

سمجھتے ہیں ناداں اسے بے ثبات ابھرتا ہے مِٹ مِٹ کے نقشِ حیات

یہ مکتب یہ اسکول یہ پاٹھ شالے

یہ تکئے یہ مندر یہ گرجے شوالے

یہ پنڈت یہ بنئے یہ ملا یہ لالے

یہ سب پیٹ ہیں اور ہم تر نوالے

غریبوں کا دنیا میں اللہ والی

وطن کیا ہے اک نوعِ سرمایہ داری

بڑے سیٹھ ہیں قوم کے بیوپاری

وہ دیکھو چلی آرہی ہے سواری

نئے جال لائے پرانے شکاری

غریبوں کا دُنیا میں اللہ والی

تُو نے یہ کیا غضب کیا مجھ کو بھی فاش کر دیا میں ہی تو ایک راز تھا سینۂ کائنات میں

اگر ہنگامہ ہائے شوق سے ہے لامکاں خالی
خطا کس کی ہے یارب لامکاں تیرا ہے یا میرا؟
اسی کوکب کی تابانی سے ہے تیرا جہاں روشن
زوالِ آدمِ خاکی زیاں تیرا ہے یا میرا؟

روزِ حساب جب مرا پیش ہو دفترِ عمل آپ بھی شرمسار ہو مجھ کو بھی شرمسار کر

جبریل و ابلیس

جبریل

ہمدمِ دیرینہ کیسا ہے جہانِ رنگ و بو؟

ابلیس

سوز و ساز و درد و داغ و جستجوے و آرزو!

جبریل

ہر گھڑی افلاک پر رہتی ہے تیری گفتگو کیا نہیں ممکن کہ تیرا چاکِ دامن ہو رفو؟

ابلیس

آہ اے جبریل تو واقف نہیں اس راز سے
کر گیا سرمست مجھ کو ٹوٹ کر میرا سبو!
اب یہاں میری گذر ممکن نہیں ممکن نہیں
کس قدر خاموش ہے یہ عالمِ بے کاخ و کو!
جس کی نومیدی سے ہو سوزِ درونِ کائنات
اُسکے حق میں تَقْنَطُوا اچھا ہے یا لَا تَقْنَطُوا؟

جبریل

کھو دیئے انکار سے تو نے مقاماتِ بلند
چشمِ یزداں میں فرشتوں کی رہی کیا آبرو!

ابلیس

ہے مری جرأت سے مشتِ خاک میں ذوقِ نمو
میرے فتنے جامۂ عقل و خرد کا تار و پو!
دیکھتا ہے تو فقط ساحل سے رزمِ خیر و شر
کون طوفاں کے طمانچے کھا رہا ہے؟ میں کہ تو؟

خضر بھی بے دست و پا الیاس بھی بے دست و پا
میرے طوفاں یم بہ یم دریا بہ دریا جُو بہ جُو!
گر کبھی خلوت میسّر ہو تو پوچھ اللہ سے
قصّۂ آدم کو رنگیں کر گیا کس کا لہو؟
میں کھٹکتا ہوں دلِ یزداں میں کانٹے کی طرح
تُو فقط اللہ ھُو، اللہ ھُو، اللہ ھُو!

قطعہ

انداز بیاں گرچہ بہت شوخ نہیں ہے
شاید کہ اُتر جائے ترے دل میں مری بات
یا وسعتِ افلاک میں تکبیرِ مسلسل
یا خاک کے آغوش میں تسبیح و مناجات
وہ مذہبِ مردانِ خود آگاہ و خدا مست
یہ مذہبِ مُلّا و جمادات و نباتات!

ترے شیشے میں مے باقی نہیں ہے؟
بتا کیا تُو مرا ساقی نہیں ہے؟

سمندر سے ملے پیاسے کو شبنم! بخیلی ہے یہ رزاقی نہیں ہے!

خدائی اہتمامِ خشک و تر ہے خداوندا خدائی دردِ سر ہے
ولیکن بندگی! استغفر اللہ یہ دردِ سر نہیں دردِ جگر ہے!

باغی مُرید

ہم کو تو میسّر نہیں مٹی کا دیا بھی
گھر پیر کا بجلی کے چراغوں سے ہے روشن!
شہری ہو دہاتی ہو مسلمان ہے سادہ
مانندِ بُتاں پُجتے ہیں کعبے کے برہمن!
نذرانہ نہیں! سود ہے پیرانِ حرم کا!
ہر خرقۂ سالوس کے اندر ہے مہاجن!
میراث میں آئی ہے انہیں مسندِ ارشاد
زاغوں کے تصرف میں عقابوں کے نشیمن!

شیر اور خچر

شیر

ساکنانِ دشت و صحرا میں ہے تو سب سے الگ
کون ہیں تیرے اب و جد؟ کس قبیلے سے ہے تو؟

خچر

میرے ماموں کو نہیں پہچانتے شاید حضور
وہ صبا رفتار، شاہی اصطبل کی آبرو

نہیں مقام کی خوگر طبیعتِ آزاد
ہوائے سیر مثالِ نسیم پیدا کر
ہزار چشمہ ترے سنگِ راہ سے پھوٹے
خودی میں ڈوب کے ضربِ کلیم پیدا کر

جب تک نہ زندگی کے حقائق پہ ہو نظر تیرا زجاج ہو نہ سکے گا حریفِ سنگ

میدانِ جنگ میں نہ طلب کر نوائے چنگ
یہ زورِ دست و ضربتِ کاری کا ہے مقام
فطرت لہو ترنگ ہے غافل! نہ جل ترنگ
خونِ دل و جگر سے ہے سرمایۂ حیات

خودی کا سِرِّ نہاں لا الٰہ اِلّا اللہ
خودی ہے تیغ، فساں لا الٰہ الا اللہ
یہ دور اپنے براہیم کی تلاش میں ہے
صنم کدہ ہے جہاں لا الٰہ الا اللہ
کیا ہے تُو نے متاعِ غرور کا سودا
فریبِ سود و زیاں لا الٰہ الا اللہ
یہ مال و دولتِ دنیا یہ رشتہ و پیوند
بتانِ وہم و گماں لا الٰہ الا اللہ
اگرچہ بُت ہیں جماعت کی آستینوں میں
مجھے ہے حکمِ اذاں لا الٰہ الا اللہ

شکر و شکایت

میں بندۂ ناداں ہوں مگر شکر ہے تیرا
رکھتا ہوں نہاں خانۂ لاہوت سے پیوند

اِک ولولۂ تازہ دیا میں نے دلوں کو
لاہور سے تا خاکِ بخارا و سمرقند!

تاثیر ہے یہ میرے نفس کی کہ خزاں میں
مرغانِ سحر خواں مری صحبت میں ہیں خورسند!

لیکن مجھے پیدا کیا اس دیس میں تُو نے
جس دیس کے بندے ہیں غلامی پہ رضامند

قُم باذن اللہ

جہاں اگرچہ دگرگوں ہے قُم باذن اللہ
وہی زمیں وہی گردوں ہے، قُم باذن اللہ

کیا نوائے انا الحق کو آتشیں جس نے
تری رگوں میں وہی خون ہے قُم باذن اللہ

غمیں نہ ہو کہ پراگندہ ہے شعور ترا
فرنگیوں کا یہ افسوں ہے قُم باذن اللہ

محرومؔ

(۱۸۸۶ء ——————)

لالہ تلوک چند محرومؔ بھگت رام دیال صاحب کے صاحبزادے ہیں ۱۸۸۶ء میں عیسےٰ خیل ضلع میانوالی میں پیدا ہوئے۔ بزرگوں کا پیشہ کاشتکاری تھا۔ لیکن اراضی کے دریا بُرد ہو جانے پر تجارت ذریعہ معاش ہوئی۔ محرومؔ صاحب کا بچپن دریائے سندھ کے کنارے پر گذرا ہے۔ مظاہر فطرت سے وابستگی اسی زمانہ کی یادگار ہے۔

آپ سات برس کی عمر میں ورنیکلر مڈل سکول عیسےٰ خیل میں داخل ہوئے۔ اور وہیں سے ورنیکلر مڈل کا امتحان پاس کیا۔ پرائمری اور مڈل کے امتحانات امتیازی حیثیت سے پاس کئے۔ اور وظائف حاصل کئے۔ انٹرنس کا امتحان میونسپل بورڈ ہائی سکول بنوں سے پاس کیا۔ اور ۱۹۰۶ء میں سنٹرل ٹریننگ کالج' لاہور سے۔ جے۔ اے وی کا امتحان پاس کر کے مشن ہائی سکول ڈیرہ اسمٰعیل خاں میں ملازم ہو گئے یہیں ایف اے۔ کا امتحان خانگی طور پر پاس کیا۔ ۱۹۱۴ء میں مشن ہائی سکول سے۔ وی۔ بی۔ ہائی سکول ڈیرہ اسمٰعیل خاں میں چلے گئے۔ نومبر ۱۹۱۵ء میں آپکی اہلیہ محترمہ کی وفات

ہوگئی۔ جس پر آپ نے نہائت ہی غم انگیز نظمیں لکھیں۔ یہ نظمیں آپ کی بہترین نظموں کا حصہ ہیں۔ اہلیہ محترمہ کی وفات کے بعد آپ کو اپنی چھوٹی لڑکی کی تعلیم و تربیت کے لئے اپنے وطن عیسےٰ خیل میں قیام کرنا پڑا۔ چنانچہ آپ ۱۹۱۶ء میں اینگلو ورنیکلر مڈل سکول عیسےٰ خیل میں ملازم بھی ہو گئے۔ یہیں دوسری شادی کر لی۔ اور بی۔ اے۔ اور ایس۔ اے۔ وی کا امتحان پرائیویٹ طور پر پاس کیا۔ ۱۹۲۵ء تک آپ عیسےٰ خیل میں سیکنڈ ماسٹر اور ہیڈ ماسٹر کے فرائض انجام دیتے رہے اور پھر تبدیل ہو کر کلور کوٹ چلے گئے۔ جہاں ۸½ سال تک ہیڈ ماسٹر رہے۔

ستمبر ۱۹۳۳ء میں آپ کو بچوں کی تعلیم کے لئے پھر دیہات سے مستعفی ہونا پڑا۔ اور آپ کنٹونمنٹ بورڈ مڈل سکول راولپنڈی کے ہیڈ ماسٹر ہو کر چلے آئے۔ جہاں تا دمِ تحریر موجود ہیں۔

محروم کو شاعری کا شوق بچپن سے ہے شروع شروع میں اُردو میں اظہار خیال مشکل نظر آیا لیکن آزاد مرحوم کی تصنیفات کے مطالعہ سے زبان پر جلا ہوگئی ۱۹۰۶ء میں جبکہ ہائی سکول میں طالب علم تھے۔ کلام 'مخزن' اور 'زمانہ' میں شائع ہونے لگا۔ محروم فطرتاً متشائم شاعر نہیں۔ وہ دلفزا مناظرِ فطرت سے پُورے طور پر محظوظ ہوتے ہیں لیکن حوادثِ روزگار نے محروم کو تشائم آشنا کر دیا ہے۔ ان ایام میں تحسر و

تمنائم سے لبریز جذبات کو جب صفحۂ قرطاس پر منتقل کیا ہے۔ تو آپ ہمہ تن مرقع رنج بنکر رہ گئے ہیں لیکن اِسکے باوجود آورد کو کہیں دخل نہیں۔ شاید اِسی کیفیت سے لسان العصر اکبرؔ مرحوم نے متاثر ہو کر حضرتِ محرومؔ کو داد دی ہے!

ہے داد کا مستحق کلامِ محروم
لفظوں کا جمال اور معانی کا ہجوم
ہے اُن کا سخن مفید دانش آموز
اُنکی نظموں کی ہے بجا ملک میں دُھوم

تصنیف

ا۔ گنج معانی ۔ آپ کی مستقل تصنیف آپکا مجموعۂ کلام ہے۔ جو اس نام سے شائع ہوا ہے۔ اِس میں مختلف عنوانات کے تحت میں ایک ہی طرح کی نظمیں یکجا جمع کر دی گئی ہیں۔ مناظرِ فطرت کا حصّہ بہترین اور دلچسپ ہے۔

انتخابِ کلام

زمزمۂ توحید

ہر ذرّہ میں ہے ظہور تیرا ہے برق و شرر میں نُور تیرا
افسانہ ترا جہاں تہاں ہے چرچا ہے قریب و دُور تیرا
ہر ذرّۂ خاک میں ہے لمعاں مخصوص نہیں ہے طُور تیرا
محتاجِ شراب و جام کب ہے جس دل کو ہوُا سرور تیرا
گاتے ہیں سحر ہوا میں کیا کیا دم بھرتے ہیں سب طیور تیرا

تو جلوہ فگن کہاں نہیں ہے
وہ جا نہیں، تو جہاں نہیں ہے

تاروں میں چمک دمک تری ہے جو رعد میں ہے کڑک تری ہے
اے باعثِ رونقِ گلستاں شاخوں میں لہک لچک تری ہے
ہر غنچے میں ہے ترا تبسّم ہر گل میں بھری مہک تری ہے

نغمے مرغانِ خوش گلو کے — کہتے ہیں یہ سب چہک تری ہے
کہتی ہے کلی کلی زباں سے — میری یہ لچک نہیں تری ہے
بشگفتہ ہے تو چمن چمن میں
خنداں ہے گلاب و یاسمن میں

اے معنیٔ نازِ نازنیناں — وے نورِ جبینِ مہ جبیناں
عالم ہے نگار خانہ تجھ سے — اے مایۂ خوبیٔ حسیناں
تیرے ہی یہ ولولے ہیں دل میں — اے ذوقِ دلِ جمال بیناں
ہیں صبر و قرار تجھ سے قائم — اے مرہمِ زخمِ غم قریناں
او وجہِ تسلیٔ دلِ زار — او موجبِ راحتِ حزیناں
پروانے کو تیری ہی لگن ہے
اور شمع میں تیری ہی جلن ہے
ناقوس میں تو، اذاں میں تو ہے — ہر شور میں، ہر فغاں میں تو ہے
گنگا میں ہیں اٹھتی تیری موجیں — زمزم کی صفائے جاں میں تو ہے

ہر قافلہ میں تری صدا ہے ہر منزل و ہر نشاں میں تو ہے
ہے تیرے بغیر کون موجود ہے کوئی اگر جہاں میں تُو ہے
سجدہ ہے ترا ہر اک کا مقصود
خالق تو ہے سب کا اور معبود

کنارِ راوی

غمِ دل آفتِ سماوی ہے زندگی موت کے مساوی ہے
زخمِ پنہاں جگر پہ حاوی ہے اشک ریزی جگر تراوی ہے
شامِ غم ہے، کنارِ راوی ہے
میں ہوں اور میری سینہ کاوی ہے

ہم کہاں اور سیرِ باغ کہاں ذوق و شوقِ دل و دماغ کہاں
گلشنِ دہر میں فراغ کہاں چین دیتے ہیں دل کے داغ کہاں

شامِ غم ہے، کنارِ راوی ہے
میں ہوں اور میری سینہ کاوی ہے

اُڑ چلے طائر آشیانوں کو   مِلا آرام باغبانوں کو
نغمے یاد آئے نغمہ خوانوں کو   کیا کروں سن کے میں ترانوں کو

شامِ غم ہے، کنارِ راوی ہے
میں ہوں اور میری سینہ کاوی ہے

خواہ چرواہے، خواہ چوپائے   شوق سے اپنے گھر کو پھر آئے
خانہ ویراں کو گھر جو یاد آئے   کیا کرے؟ ہائے کوئی بتلائے

شامِ غم ہے کنارِ راوی ہے
میں ہوں اور میری سینہ کاوی ہے

مہرِ تاباں تھا مائلِ آرام   کوہِ مغرب میں جا کیا بسرام
سو گیا لے کے تن پہ چادرِ شام   اُس کے آرام سے مجھے کیا کام

شامِ غم ہے کنارِ راوی ہے
میں ہوں اور میری سینہ کاوی ہے

آنکھ کھولی اِدھر ستاروں نے   جلوے دکھلائے ماہ پاروں نے

گو اشارے کئے ہزاروں نے   آنکھ اٹھائی نہ غم کے ماروں نے

شامِ غم ہے کنارِ راوی ہے

میں ہوں اور میری سینہ کاوی ہے

جلوے دکھلائے گورے گالوں نے   جال پھیلائے کالے بالوں نے

دل کئے نذر شوق والوں نے   مجھ کو گھیرا مرے خیالوں نے

شامِ غم ہے کنارِ راوی ہے

میں ہوں اور میری سینہ کاوی ہے

کئی بچھڑے ہوئے ملے ہونگے   شکوے کچھ ہونگے کچھ گلے ہونگے

آرزوؤں کے گل کھلے ہونگے   دامنِ شوق میں صلے ہونگے

شامِ غم ہے کنارِ راوی ہے

میں ہوں اور میری سینہ کاوی ہے

میکدوں میں چراغ روشن ہیں   نورِ مے سے ایاغ روشن ہیں

کر مکِ شب چراغ روشن ہیں   یا مرے دل کے داغ روشن ہیں

شامِ غم ہے کنارِ راوی ہے

میں ہوں اور میری سینہ کاوی ہے

بیقراری ہے، کیا خبر، کیوں ہے　　آہ و زاری ہے، کیا خبر، کیوں ہے
دلفگاری ہے، کیا خبر، کیوں ہے　　اشکباری ہے، کیا خبر، کیوں ہے

شامِ غم ہے، کنارِ راوی ہے
میں ہوں اور میری سینہ کاوی ہے

آہ! اے دردِ نوجوانی آہ!　　آہ! اے موت کی نشانی آہ!
کیا ہوئی دل کی شادمانی آہ!　　ہے کدھر مرگِ ناگہانی آہ!

شامِ غم ہے، کنارِ راوی ہے
میں ہوں اور میری سینہ کاوی ہے

دلِ وحشی کا مدعا غم ہے　　ابتدا غم ہے انتہا غم ہے
یوں تو دل پر مرے سدا غم ہے　　غمِ مرگِ پدر نیا غم ہے

شامِ غم ہے، کنارِ راوی ہے
میں ہوں اور میری سینہ کاوی ہے

المدد! سیلِ گریۂ خوناب　　سوزِ پنہاں سے ہو چلا ہوں کباب
گلخنِ غم میں ہے دلِ بیتاب　　کہ تڑپتا ہے صورتِ سیماب

شامِ غم ہے، کنارِ راوی ہے

میں ہوں اور میری سینہ کاوی ہے

عیدبھی ہو مجھے محرم ہے　　میرا سینہ ہے خنجرِ غم ہے
خونفشاں کب سے چشم پُرنم ہے　　دشتِ غربت ہے شام ماتم ہے
شامِ غم ہے کنارِ راوی ہے
میں ہوں اور میری سینہ کاوی ہے

نور جہاں کا مزار

دن کو بھی یہاں شب کی سیاہی کا سماں ہے
کہتے ہیں یہ آرام گہہ نور جہاں ہے
مدت ہوئی، وہ شمع تہ خاکِ نہاں ہے
اُٹھتا مگر اب تک سرِ مرقد سے دھواں ہے
جلووں سے عیاں جن کے ہوا طور کا عالم
تربت پہ ہے اُن کی شبِ دیجور کا عالم
اے حسنِ جہاں سوز! کہاں ہیں وہ شرارے

کس باغ کے گل ہو گئے؟ کس عرش کے تارے؟
کیا بن گئے اب کرمکِ شب تاب وہ سارے؟
ہر شام چمکتے ہیں جو راوی کے کنارے
یا ہو گئے وہ داغ جہانگیر کے دل کے؟
قایل ہی تو تھے عاشقِ دل گیر کے دل کے

تجھ سی ملکہ کے لئے یہ بارہ دری ہے
غالیچہ سرِ فرش ہے کوئی، نہ دری ہے
کیا عالمِ بیچارگی اے تاجوری ہے
دن کو یہیں بسرام، یہیں شب بسری ہے
ایسی کسی جوگن کی بھی کٹیا نہیں ہوتی
ہوتی ہو، مگر یوں سرِ صحرا نہیں ہوتی

تعویذِ لحد ہے زبر و زیر، یہ اندھیر!
یہ دورِ زمانہ کے اُلٹ پھیر، یہ اندھیر!
آنگن میں پڑے گرد کے ہیں ڈھیر، یہ اندھیر!
اے گردشِ ایام! یہ اندھیر، یہ اندھیر!

ماہِ فلکِ حسن کو یہ بُرجِ بلا ہے
اے چرخ ترے حُسنِ نوازش کا گلا ہے

حسرت ہے ٹپکتی در و دیوار سے کیا کیا!
ہوتا ہے اثر دل پہ اِن آثار سے کیا کیا!
نالے ہیں نکلتے دلِ افگار سے کیا کیا!
اُٹھتے ہیں شرر آہِ شرر بار سے کیا کیا!

یہ عالمِ تنہائی یہ دریا کا کنارہ
ہے تجھ سی حسینہ کے لئے ہُو کا نظارہ

چوپائے جو گھبراتے ہیں گرمی سے تو اکثر
آرام لیا کرتے ہیں اِس روضے میں آ کر
اور شام کو بالائی سیہ خانوں سے شپّر
اُڑ اُڑ کے لگاتے ہیں در و بام پہ چکر

معمور ہے یوں محفلِ جانانہ کسی کی
آباد رہے گورِ غریبانہ کسی کی

آراستہ جن کے لئے گلزار و چمن تھے

جو نازکی میں داغ دہِ برگِ سمن تھے
جو گل رُخ و گل پیرہن و غنچہ دہن تھے
شاداب گلِ تر سے کہیں جن کے بدن تھے
پژمردہ وہ گل دب کے ہوئے خاک کے نیچے
خوابیدہ ہیں خاروخس و خاشاک کے نیچے

رہنے کے لئے دیدہ و دل جن کے مکاں تھے
جو پیکرِ ہستی کے لئے روحِ رواں تھے
محبوب دلِ خلق تھے، جاں بخشِ جہاں تھے
تھے یوسفِ ثانی، کہ مسیحائے زماں تھے
جو کچھ تھے، کبھی تھے، مگر اب کچھ بھی نہیں ہیں
ٹوٹے ہوئے پنجر سے پڑے زیرِ زمیں ہیں

دُنیا کا یہ انجام ہے، دیکھ اے دلِ ناداں!
ہاں بھول نہ جائے تجھے یہ مدفنِ ویراں
باقی ہیں نہ وہ باغ نہ وہ قصر نہ ایواں
آرام کے اسباب نہ وہ عیش کے ساماں

ٹوٹا ہوا اِک ساحلِ راوی پہ مکاں ہے
دن کو بھی جہاں شب کی سیاہی کا سماں ہے

اشکِ حسرت

(اہلیہ کی وفات پر)

یہ آج ہونے لگی ہے کدھر کی تیاری
ہے بے طرح مترشح نظر سے بیزاری
کہاں ہے آج تمہاری وہ طرزِ غمخواری
کہ بے اثر مرے نالے ہیں بے اثر زاری

یہ ہاتھ جوڑ کے مجھ سے معافیاں کیسی
چھڑی ہے آج یہ رخصت کی داستاں کیسی

ذرا تو دھیان کرو میرے سوزِ غم کی طرف
چلے ہو تاروں کی چھاؤں میں کیوں عدم کیطرف
نظر اُٹھاؤ ذرا میری چشمِ نم کی طرف

بڑھاؤ ہاتھ نہ اے جاں مرے قدم کی طرف
مجھے تو روکتے ہو بار بار رونے سے
رکو گے کیا نہ مرے زار زار رونے سے

نہ کر کے جاؤ مجھے آہ! خانماں برباد
نہ دے کے جاؤ مجھے شغلِ نالہ و فریاد
رکھا ہے میں نے تمہیں اور تم نے مجھ کو شاد
نہ جھیلی جائے گی، ہجرِ دوام کی اُفتاد

کیا تھا عہدِ وفا مجھ سے عمر بھر کے لئے
ابھی سے ہو گئے تیار کیوں اُدھر کے لئے

گذرنے پائے ہیں مشکل سے پانچ سال ابھی
شباب پر ہے تمہارا تو بال بال ابھی
عروج پر ہے عروسانہ چال ڈھال ابھی
نہ لاؤ موت کا دل میں ذرا خیال ابھی

تمہارے مرنے کے اے جاں! یہ دن نہیں ہرگز
جہاں سے اُٹھنے کو یہ سال و سن نہیں ہرگز

دوا دوش مری بیکار جائے گی؟ افسوس!
دُعا مرے نہ کسی کام آئے گی؟ افسوس!
اجل جہاں سے تمہیں آج اُٹھائیگی؟ افسوس!
زمانہ بھر کے ستم مجھ پہ ڈھائیگی؟ افسوس!

فلک کو رحم نہ ودّیا وتی پہ آئے گا
غریب و بیکس و معصوم کو رلائے گا

لو اُٹھ کے بیٹھو کہ ودّیا سرہانے آئی ہے
تمہارے منہ سے وہ دامن اٹھانے آئی ہے
ادائے طفلی کوئی تو دکھانے آئی ہے
کہ ہنستی آتی ہے۔ تم کو ہنسانے آئی ہے

وہ چل کے آئی ہے گھٹنوں پہ تھک گئی ہوگی
تمہارے پیار سے پھر اُس کو تازگی ہوگی

اُٹھا بھی لو کہ بہت بے قرار ہے ودّیا
نگاہِ مہر کی اُمید وار ہے ودّیا
رہینِ سختیٔ صد انتظار ہے ودّیا

نہ چھوڑ جاؤ اِسے شیر خوار ہے وِدّیا
پکارتی ہے تمہیں آج کس قرینے سے
اُبل کے شیر ٹپکتا نہیں ہے سینے سے؟
تمہاری مادرِ ناشاد ہے سرِ بالیں
خراب حال ستمدیدہ۔ خستہ و غمگیں
سُنائی دیتے نہیں اُس کے نالہائے حزیں
یہ خوابِ ناز ہے کیا۔ چونک کر اُٹھو بھی کہیں
ذرا تو یاد کرو دِل فگاریاں اُس کی
بھلاؤ دل سے نہ تیمارداریاں اُس کی

کِسی سے کرتے نہیں کوئی بات۔ وااسفا!
نہ تھے تم ایسے تغافل صفات۔ وااسفا!
دھرے ہی رہ گئے نبضوں پہ ہات۔ وااسفا!
کٹے گی کِس سے یہ ماتم کی رات۔ وااسفا!

چلے ہو چھوڑ کے روتا ہوا غریبوں کو
ہمیشہ روتے رہیں گے. یونہی نصیبوں کو

خیال میرے دلِ دردمند کا کرتے
شریک شادی و غم تھے تو پھر وفا کرتے
نہ دیتے داغِ جدائی تو کیا بُرا کرتے
فلک سے آج نہ ہم شکوہ و جفا کرتے

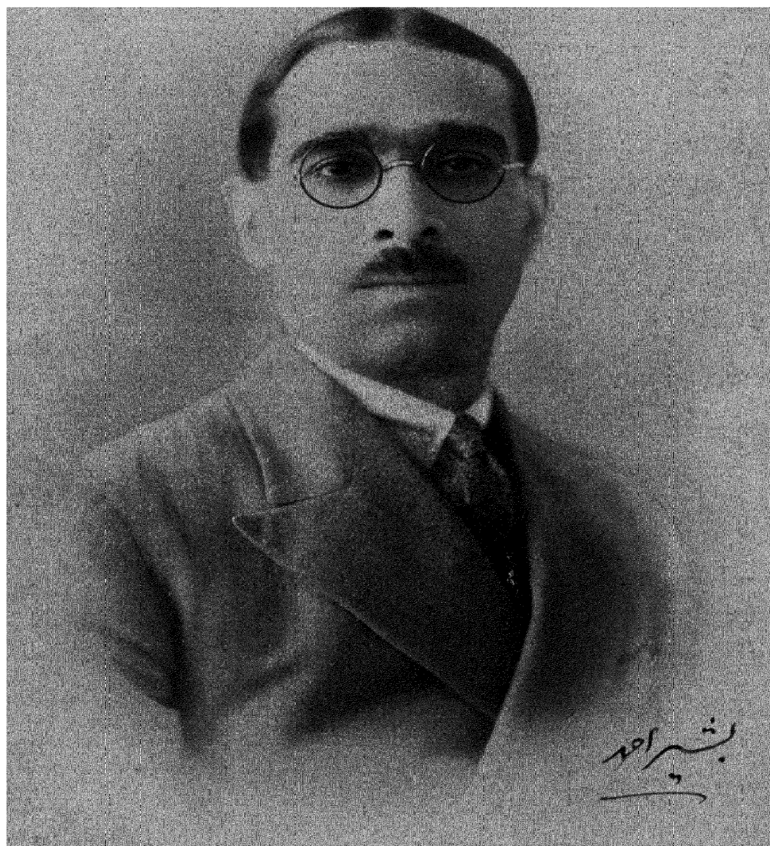
چلے ہو گھر کو - مگر ہاں وہ کونسا گھر ہے؟
عزیز اس سے کوئی اور بھی سوا گھر ہے؟

———————————

———————————

———————————




بشیر احمد

زارؔ

(۱۸۹۳ء ————)

میاں بشیر احمد صاحب زارؔ آنریبل جسٹس میاں محمد شاہدین ہمایوںؔ مرحوم کے صاحبزادے ہیں۔ آپ ۲۹ مارچ ۱۸۹۳ء کو باغبانپورہ میں پیدا ہوئے۔ تقریباً ایک سال تک اپنے گاؤں میں الہ دین کی مسجد میں تعلیم پاکر باغبانپورہ کے سکول میں داخل ہوئے۔ پھر چند ماہ بعد سنٹرل ماڈل سکول، لاہور میں چلے آئے۔ جہاں سے ۱۹۰۸ء میں انٹرنس کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۱۰ء میں گورنمنٹ کالج سے ایف اے پاس کیا۔ اور پھر ولائت چلے گئے۔ وہاں آکسفرڈ میں واڈھم کالج سے ۱۹۱۳ء میں تاریخ میں بی۔ اے (آنرز) کی ڈگری حاصل کی۔ اپنے کالج میں اور ہندوستانی طلباء میں اس سال تاریخ کے امتحان میں اوّل رہے۔ سکول اور کالج میں عربی بھی پڑھتے رہے ہیں اور ہمیشہ اِس مضمون میں اوّل رہتے تھے۔

چھ سات برس کی عمر میں شاعری شروع کی ابتداءً چھپ چھپ کے لکھتے رہے اور کسی سے باقاعدہ اصلاح نہ لی۔ ولائت سے واپس آنے پر مخزن میں ابجد خواں،

کے نام سے نثر کے مضامین اور چند نظمیں شائع کرائیں۔ پھر جنوری ۱۹۲۱ء میں ہمایوں رسالہ جاری کیا۔ اس میں آپ کی تین نظمیں وقتاً فوقتاً شائع ہوتی رہتی ہیں۔ مزاحیہ نظمیں عزیزوں اور دوستوں کے دائرہ تک محدود رکھتے ہیں۔

میاں صاحب موصوف کی نظم اور طبعزاد نثر بیشتر ذاتی واردات کا آئینہ ہوتی ہے۔ تکلف سے آپ کو نفرت ہے۔ اس لئے ذہنی کیفیات کو بلا جھجک بیان کرتے چلے جاتے ہیں۔ اور یہی چیز آپ کو ہمارے قدیم مشرقی تکلف نواز ادبا سے ممتاز کرتی ہے۔ آپ کے کئی ایک تاریخ اور فلسفہ سے متعلق مفید مضامین ہمایوں میں شائع ہو چکے ہیں لیکن مستقل طور پر صرف ایک ہی تصنیف شائع کی ہے۔ جو آپ کے طبعزاد مضامین پر مشتمل ہے۔

شروع سے ہی آپ کی طبیعت عزلت پسند رہی ہے۔ مغربی تعلیم اور مغربی زندگی سے مانوس ہونے کے باوجود آپ کے خیالات سراسر مشرقی ہیں۔ ہر امر میں صفائی اور متانت کا لحاظ رکھنا آپ کی عادت کا خاصہ ہے۔ پاکیزگی زندگی کا ایک جزو بن چکا ہے۔ دماغی کام کی وجہ سے صحت عموماً خراب رہتی ہے۔ اس لئے کچھ عرصہ سے پہلے کی نسبت مطالعہ اور ادبی کام کم کر دیا ہے۔

تصنیف

طلسمِ زندگی:۔ آپکے اُن طبعزاد مضامین کا مجموعہ ہے جن میں سے بیشتر ہُمایوں ہیں شائع ہو چکے ہیں۔ جہاں کتاب کی ترتیب واشاعت میں اپنے حُسنِ ذوق کا ثبوت دے کر اردو میں ظاہری حیثیت سے اپنی قسم کی پہلی کتاب شائع کی ہے۔ وہاں آپ نے اپنے تاثراتِ قلبی کو جس دیانتداری اور خلوص سے صفحۂ قرطاس پر منتقل کیا ہے۔ وہ میاں صاحب کا ہی حصّہ تھا۔ یں آپ اور دوسرے لوگ سب اپنی زندگی کے معمولی معمولی واقعات سے محظوظ ہوتے ہیں لیکن یہ قوت فطرت نے صرف میاں صاحب موصوف کو ہی ودیعت کی ہے۔ کہ وہ اپنی خوشیوں اور اپنے غموں کا بیان کر کے قاری کو اپنے افکار میں شریک کر لیتے ہیں۔ یہانتک کہ بعض دفعہ آپ یہ محسوس کرنے لگتے ہیں کہ آپ نے کیوں نہ یہ مضمون لکھ دیئے لیکن ہر کسے را بہر کارے ساختند۔ زندگی کے روزمرہ نشیب و فراز سے تاثرات قبول کرنا اور پھر اُن کو بجنسہٖ قلمبند کر دینا ہر ایک کا کام نہیں۔ اردو ادب میں 'طلسمِ زندگی' اپنی نوعیت کا اوّلین اضافہ ہے۔

انتخابِ کلام

شالامار باغ

آہ اے باغِ کہن اے یادگارِ انبساط
آہ اے جلوہ گہہِ ہنگامۂ عہدِ نشاط
رشکِ صد گلزارِ جنت تھا کبھی تیرا چمن
تیری شوکت سے عیاں تھی شانِ ربِ ذوالمنن
کھیلتی تھیں تیرے پھولوں سے کبھی شہزادیاں
تیرے گلشن میں کبھی تھیں حسن کی آبادیاں
آہ وہ دن تیری محفل میں تھی جب خوشیوں کی دھوم
تیرے گلزاروں میں جب تھا گلعذاروں کا ہجوم
کیا ہوئے وہ دن کہ گہوارہ تھا آزادی کا تو
وائے قسمت آج نظارہ ہے بربادی کا تو

یاد ہے تجھ کو کہ وہ شاہنشہِ عالی وقار
جس کے ہر اسلوب پر حسنِ تناسب تھا نثار
پائداری کو محبت جس کی تعمیروں سے تھی
تقویت قوم و وطن کو جسکی تدبیروں سے تھی
حُسن کی کیفیتوں سے جس کا دل سرشار تھا
علم کا آئینہ جس کا دیدۂ بیدار تھا
آ نکلتا تھا اِدھر جب اپنے توسن پر سوار
پھول برساتی تھی اُس کی راہ میں فصلِ بہار
شاہ کے آتے ہی فواروں کا ہر سو چھوٹنا
وہ ترنم وہ طلسمِ خامشی کا ٹوٹنا
آہ وہ پھولوں کے تختے آہ وہ چڑیوں کا شور
چادرِ آبِ رواں میں آہ وہ پانی کا زور
آہ وہ ذوقِ سخن وہ انجمن آرائیاں
آہ وہ شوقِ حقائق وہ فلک پیمائیاں
آہ وہ دن جب کہ شاہِ ہند تھا شاہ جہاں

وقف تھا ہندو مسلم کے لئے ہندوستاں

آہ وہ جانبازیاں وہ اتحادِ باہمی

آہ وہ ایثار جس کی آج ہے اتنی کمی

وہ سخاوت وہ صداقت وہ شجاعت کیا ہوئی

وہ مروت وہ مودت وہ محبت کیا ہوئی

اب کہاں وہ ہمتیں ہیں اب کہاں وہ اُلفتیں

چھا رہی ہیں گلشنِ ہندوستاں پر ظلمتیں

کر دے پھر یارب تو اپنے نور کا مسکن اِسے

پھر بنا دے پھولتا پھلتا ہوا گلشن اِسے

بھڑک اُٹھا ہے شعلہ دل میں یہ کیسی محبت کا؟ کہ میری رُوح پر ٹوٹا ہے اِک طوفاں مسرت کا

ضیائے عشق سے روشن ہوئی ہے زندگی میری یہ پرتو پڑ گیا کس ماہِ تاباں کی مروت کا

غرض کی زندگی سے موت اچھی ہے کہیں اے دل وہ جینا کیا ہے جس میں ہو خیال اپنی ہی راحت کا

رباعیات

مانا کہ ہے عقل کا فسانہ دُنیا
کارندہ ہے عقل کا رخانہ دُنیا
دُنیا کو بنایا اُس نے دُنیا لیکن
شاید کہ ہو عقل کا بہانہ دُنیا

غم دے کے مجھے بنالیا ہے اپنا
کم دے کے مجھے بنالیا ہے اپنا
اللہ رے کرم! فریبِ الفت تیرا
دم دے کے مجھے بنالیا ہے اپنا

دیکھے کوئی صورت تری گلزاروں میں
پائے کوئی عظمت تری کہساروں میں
سوتی ہو جب آرام سے ساری دنیا
ڈھونڈے کوئی راتوں کو تجھے تاروں میں

---

*

سالکؔ

(۱۸۹۴ء ـــــــــ)

مولانا عبدالمجید سالکؔ بٹالہ (ضلع گورداسپور) کی مردم خیز سرزمین کے رہنے والے ہیں۔ ۱۳ر دسمبر ۱۸۹۴ء بروز پنجشنبہ پیدا ہوئے تھے۔ آپ کے دادا مولوی میر محمدؒ صاحب بہت واجب الاحترام عالم اور صالح بزرگ تھے۔ اور آپ کے والد منشی غلام قادر صاحب حال ہی (۱۹۳۴ء) میں پٹھانکوٹ سے میونسپل سکرٹری کے عہدہ سے ریٹائر ہوئے ہیں۔

آپ کی ابتدائی تعلیم مڈل تک پٹھانکوٹ میں ہوئی اور انٹرنس کا امتحان بٹالہ سے پاس کیا۔ اس کے بعد کچھ عرصہ تک چند عارضی ملازمتیں قبول کیں۔ لیکن چونکہ ادب و شعر کا ذوق موروثی تھا۔ اس لئے یہ آپ کو کشاں کشاں ایک مستقل شاہراہ پر لا رہا تھا چنانچہ آپ نے ۱۹۱۴ء میں ادبی رسالہ "فانوس خیال" پٹھانکوٹ سے جاری کیا جس میں مشاہیر ملک مضمون لکھتے رہے۔ اسی زمانہ میں آپ نے نثر نگاری کی ابتدا کی۔ حالات کی نامساعدت کی وجہ سے یہ رسالہ آٹھ

نو ماہ سے زیادہ عرصہ کے لیئے نہ چل سکا۔ اور آپ ۱۹۱۵ء کے اواخر میں لاہور چلے آئے۔ اور مولانا سید ممتاز علی کے جرائد 'پھول' اور 'تہذیب نسواں' کے ایڈیٹر مقرر ہو گئے۔ اسی دوران میں مولانا موصوف کے صاحبزادے سید امتیاز علی صاحب تاج نے 'کہکشاں' جاری کیا جس میں حضرتِ سالک نے اپنی زندگی کے بہترین ادبی اور تنقیدی مضامین اور افسانے اشاعت کی غرض سے دیئے۔ یہی زمانہ آپ کی ادبی و شعری شہرت کا زمانہ ہے۔ اور اسی دوران میں آپ نے بہترین غزلیں اور نظمیں لکھیں۔

۱۹۲۰ء میں جب 'زمیندار' نکلا۔ تو مولانا ظفر علی خاں نے آپکو 'زمیندار' کے ادارہ میں شامل ہونے کی دعوت دی۔ اُن کے اصرار پہ آپ یکم مئی ۱۹۲۰ء کو پہلی ملازمت ترک کر کے 'زمیندار' کے عملہ میں شامل ہو گئے۔ اور چند ہی روز میں انچارج ایڈیٹر قرار پائے، یہ زمانہ ادبی اور شعری زندگی کے اختتام کا زمانہ تھا۔ سیاسی اور صحافتی سرگرمیوں میں آپ نے اس قدر انہماک ظاہر کیا۔ کہ اُس کے بعد آجتک مستقل طور پر کام کرنے کا موقعہ بہت کم ملا ہے۔ البتہ اخبار کے سلسلہ میں افکار و حوادث کا کالم مستقل طور پر لکھنے کے علاوہ بعض ہنگامی اور اخباری نظمیں بھی لکھیں۔

۲۴ر نومبر ۱۹۲۱ء کو آپ تحریکِ عدم تعاون کے سلسلہ میں گرفتار ہوئے۔ اور

ایک سال میانوالی جیل میں بسر کیا بعض اچھی غزلیں اسی زمانۂ اسیری کی یادگار ہیں نومبر ۱۹۲۲ء میں رہا ہو کر پھر زمیندار کے ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ اور بی۔اے کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۲۶ء میں "زمیندار" سے چند ماہ کی رخصت لی۔ اور دارالاشاعت پنجاب لاہور کے ایما پر سے معلوماتِ عامہ کی چند کتابیں اسکولوں کی لائبریریوں کے لئے لکھیں اسی زمانہ میں ایک آدھ افسانہ اور ایک دو نظمیں بھی لکھیں۔

۱۲ مارچ ۱۹۲۷ء کو "زمیندار" سے مستعفی ہو کر آپ نے ۲ اپریل ۱۹۲۷ء کو مولینا غلام رسول مہرؔ کی معیت میں اپنا اخبار "انقلاب" جاری کیا۔ جو اب تک نہائت کامیابی سے شائع ہو رہا ہے۔ اور حضرتِ سالکؔ کو از سرتاپا سیاسیات و صحافت میں مستغرق رکھتا ہے۔

حضرتِ سالکؔ کی شعرگوئی کا آغاز ۱۹۰۹ء میں ہوا۔ پہلے یو۔پی کے رنگ کی غزل لکھتے رہے۔ بعد میں جب نظمیں کہنے لگے۔ اور علامہ سر اقبال کا پرتو پڑا تو رنگِ سخن یکسر بدل گیا۔ "فانوسِ خیال" میں بعض نظمیں اسی جدید رنگ میں نکلیں۔ نثر میں چند ایک افسانے لکھے۔ اور کچھ ترجمہ کئے۔ لیکن آپ کی بیشتر شہرت کا مدار "افکار و حوادث" پر ہے۔ جس کی بے پناہ ظرافت، ادبی چاشنی اور طنزیہ انداز نے دشمنوں سے بھی خراجِ تحسین وصول کیا ہے۔ یہی ایک چیز ہے۔ جو ادبی دنیا سے حضرتِ سالکؔ

کے تعلق کو اب تک برقرار رکھے ہوئے ہے۔ ورنہ چند ایک مقتدر جرائد میں چند فرمائشی سطور لکھ دینے یا تھوڑا سا ترجمہ کر دینے کے سوا ادبی نثر و نظم سے بے تعلقی ہو چکی ہے ہاں آپ اب تک اپنے ملنے والے ادیب نوجوانوں کی حوصلہ افزائی، ان کی ادبی رہنمائی اور اصلاحِ کلام کا کام بے نفسی اور خلوص سے انجام دے رہے ہیں۔ اور یہ سلسلہ گذشتہ پندرہ بیس سال سے جاری ہے۔ پنجاب کے اکثر ممتاز ادبار اور انشا پرداز اپنی ادبی زندگی کے لئے مولانا سالک کے ممنون ہیں۔

افکار و حوادث کا مطالعہ کرنے والے اکثر حضرات یہ سمجھتے ہیں۔ کہ شائد مولانا سالک ایسے انسان ہیں۔ جن سے ملاقات کا ہر لحظہ قہقہوں میں بسر ہوتا ہوگا لیکن یہ غلط ہے۔ سالک بعض دفعہ روتے ہوتے افکار و حوادث' لکھ رہے ہوتے ہیں، لیکن اس انداز میں کہ اگر آپ اُس کے مطالعہ سے بلند قہقہے نہیں لگا سکتے تو کم از کم آپ کی مضمحل طبیعت کو اس قدر آسودگی ضرور حاصل ہوتی ہے۔ کہ آپ کے ہونٹوں پر تبسم کھیلنے لگتا ہے۔ سالک کی عام گفتگو نہایت متین اور سنجیدہ ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ اگر آپ یہ آرزو لیکر اُن سے ملیں۔ کہ افکار و حوادث کا نمایاں عنصر اُن کی گفتگو میں موجود ہوگا۔ تو آپ کو اُن سے مایوسی ہوگی۔ اُن کی طبیعت فطری طور پر نقادانہ واقع ہوئی ہے۔ اور جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں۔ اُنکی تنقید

حب صفحۂ قرطاس پر منتقل ہوتی ہے۔ تو مزاح اور طنز کا رنگ اختیار کر لیتی ہے۔

تصانیف

۱۔ چمپا اور دیگر افسانے:۔ آپ کے چند افسانوں کا مجموعہ ہے۔

۲۔ راہ و رسم منزلہا:۔ آپ کی چند ابتدائی اردو اور فارسی نظموں کا مجموعہ ہے۔ ان دونوں کتابوں کی ترتیب احباب نے اس وقت کی جب مولینا سالک جیل میں تھے۔

۴۔ چترا۔
۵۔ نیا چاند } ٹیگور کی دو مشہور تصانیف کا ترجمہ۔

۶۔ الف لیلئے جدید:۔ آر ایل۔ اسٹیونسن کی تصنیف کا ترجمہ ہے۔

۷۔ خودکشی کی انجمن
۸۔ راجا کا ہیرا
۹۔ قصرِ ساحل } انگریزی افسانوں کے ترجمے ہیں۔

۱۰۔ آئینِ حکومتِ ہند

۱۱۔ امداد باہمی۔

۱۲- کاریگری۔ ۱۵- سیاحوں کی کہانیاں
۱۳- ایجادات۔ ۱۶- قدیم تہذیبیں۔
۱۴- دانایانِ فرنگ

تمام تعلیمی تالیفات ہیں - اور بچوں کے مفاد کے لئے لکھی ہیں -

صدائے سروش

صدا آئی سروشِ غیب کی کل گوشِ مسلم میں
کہ اے پابندِ زنجیرِ طلسمِ ہیچ مقداری

اسیرِ قیدِ ظلمت خانۂ حرص و ہوا کیوں ہے
تجھے لازم ہے مثلِ شمعِ محفل شانِ خودداری

تری واماندگی پہ آبلہ پائی بھی روتی ہے
غبارِ کارواں ہے تیری شانِ گرم رفتاری

چراغِ نورِ ارشاد و ہدایت ٹمٹماتا ہے
مبادا اُس کو گُل کردے ہوائے چرخِ زنگاری

مسلط ہے فضائے دہر پر تاریکیٔ باطل
تو نورِ حق ہے کر اطراف عالم میں ضیا باری

عیاں آثارِ بیداری ہیں چشم اہلِ عالم میں
تجھے لازم نہیں بالیں و بستر کی پرستاری

تزلزل ڈال دے ایوانِ استبداد میں ایسا
کہ استحکام حریت ہو اس گھر کی نگونساری

تجھے امید غمخواری نہ رکھنی چاہیئے ان سے
سکھائے جن کا مشرب فتنہ پردازی ستمگاری

تجھے احساسِ بربادیٔ خرمن ہو تو کیونکر ہو
کہ احبابِ کرم گستر ہیں سرگرمِ شرر باری

مگر یہ یاد رکھنا چاہیئے اُن بدنصیبوں کو
کہ رسوائی و خواری ہے مآلِ مسلم آزاری

خدا کو جب کسی کا خاتمہ منظور ہوتا ہے
جہاں میں دشمنِ اسلام وہ مشہور ہوتا ہے

مُطرب اور شاعر

اِک شاہراہ پر کوئی مطرب تھا نے نواز
تھی جسکے سوزِ دل سے منور صدائے ساز

تھا اسکی نے میں کیفِ سرودِ ازل کا رنگ
تھی جلوہ ریز جامِ حقیقت مئے مجاز

لیکن فغانِ نے کو نہ سنتے تھے راہ گیر
سب کا مذاقِ نغمہ تھا محرومِ امتیاز

غالب ہوا تھا ذوقِ نواہائے درد پر
شورِ کشاکشِ حسد و بغض و حرص و آز

مایوس ہو کے مطربِ دل خستہ چل دیا
اندوہ میں چھپائے ہوئے اک جہانِ راز

چھیڑا پہنچ کے دُور اسی نے نواز نے
سوزِ نفس سے پھر وہی آہنگِ جاں نواز

آزاد ہو کے شورشِ انبوہ عام سے
گونجی فضا میں نے کی نوائے جگر گداز

بجلی گری جہاں کے متاعِ ثبات پر
چنگاریاں سی اُڑنے لگیں کائنات پر

شاعر کہ جسکے دم سے ہے ہر دم بہشتِ گوش
خمخانۂ حیات کی گلبانگِ نا و نوش

اس کی نگاہ پر ہے عیاں رازِ کائنات
اِسکے دماغ میں ہے خیالات کا خروش

لیکن پیام اس کا سمجھتا نہیں کوئی
سب ہیں ہوا و حرص کی دنیا میں سخت کوش

اِس غم سے شیشۂ دلِ شاعر شکستہ ہے
میخانۂ خیال کی ہیں شورشیں خموش

صحرائے دل میں یاس کی آہیں سموم خیز   داماںِ غم پہ خون کے آنسو چمن فروش

لیکن ذرا زمانہ گذرنے کی دیر ہے   ہونے کو ہے کشاکشِ امروز وقفِ دوش

ہو جائیگا جو قُلزُمِ ماضی میں غرق حال   واپس ملیگی بزمِ جہاں کو متاعِ ہوش

اس وقت کہنہ ہوگی مئے صافیٔ سخن   ہوگا شرابِ شعر کا ساقی سُبو بدوش

نغمہ ہے دلفریب تو بُعدِ مکاں سے ہے

وابستہ کیفِ شعر مرورِ زماں سے ہے



ناصرؔ

(۱۸۹۶ء ۔۔۔۔۔۔۔۔)

منشی محمد ظہور صاحب ناصرؔ ۶ ر اکتوبر ۱۸۹۶ء کو گجرات (پنجاب) میں پیدا ہوئے
یہی آپکا وطن مالوف ہے۔ چونکہ آپ کے والد منشی نور احمد صاحب ملازمت کے سلسلہ
میں گجرات سے چند میل کے فاصلہ پر قصبہ جلالپور میں مقیم تھے۔ اس لئے آپکی ابتدائی
تعلیم جلالپور میں ہی ہوئی۔ بعد میں گجرات چلے آئے۔ اور مشن ہائی اسکول سے
میٹرک کے امتحان میں شریک ہو کر کامیاب ہوئے۔

حالات کی نامساعدت سے آئندہ تعلیم کو جاری نہ رکھ سکے۔ اور ڈسٹرکٹ بورڈ
اسکول کنجاہ[۱] میں مدرس کی حیثیت سے ملازم ہو گئے لیکن اس پیشہ سے اتنی دلچسپی نہ
تھی۔ اس لئے بعد میں مختلف حیثیتوں سے کچہری اور میونسپلٹی میں ملازم رہ کر ۱۹۱۹ء
میں سیاسیات میں حصہ لینا شروع کیا۔ اور قومی اور ملی تحریکات میں اتنا انہماک
ظاہر کیا۔ کہ اپنے آپ کو ہمیشہ اسی کام کے لئے وقف کر دیا۔

---

[۱] گجرات کے قریب ایک قصبہ ہے۔

۱۹۲۴ء میں جب جامعہ ملیہ کے زیر اہتمام بہت سے آزاد اسکول جاری کئے گئے۔ تو آپ نے ہندوستان کے تمام آزاد اسکولوں کو درسی کتابیں بہم پہنچانے کا ٹھیکہ جامعہ ملیہ سے لیا۔ اور گجرات میں دار الکتب ملیہ اسلامیہ کی بنیاد رکھی۔

تحریک خلافت کی ہنگامی زندگی کے ساتھ آزاد اسکول بھی بند ہو گئے۔ اور ناصر صاحب کو بھی اپنے کتب خانہ کو خیرباد کہنا پڑا۔ چنانچہ کچھ عرصہ تک سیاسی تحریکات میں مصروف رہ کر اب آپ نے پھر گجرات میں دار الکتب ملیہ اسلامیہ کا احیاء کیا ہے لیکن اب جامعہ ملیہ دہلی کی مطبوعات کے علاوہ قلمی کتب اور نوادر کی تجارت میں مصروف ہیں۔

ذوقِ شعر فطری ہے لیکن اس ذوق کی تربیت فارسی اور اردو کی کلاسکی تصانیفِ نظم ونثر کے اس قدر کثیر مطالعہ سے کی ہے کہ اپنی بینائی کمزور کر لی ہے۔ چنانچہ اس وقت مطالعہ کرنے سے محروم ہیں۔ گو اُن کے دیگر قوئے ہر لحاظ سے درست ہیں۔

آپ کو مرزا نثار حسین صاحب مبصر دہلوی سے شرفِ تلمذ حاصل ہے۔ لیکن ابتدا میں اصلاح کی ضرورت محسوس کرتے تھے۔ بعد میں صرف کبھی کبھی اپنے اشعار انہیں جاکر سنا دیا کرتے تھے۔

غالب اور فارسی کے اکثر شعراء کے کلام کا کثیر مطالعہ کیا ہے۔ اس لئے فارسی تراکیب کا اکثر استعمال کرتے ہیں۔ بلکہ جدید تراکیب وضع کرنے میں بھی باک سے کام نہیں لیتے۔ خواہ کلام کتنا ہی مشکل کیوں نہ ہو جاتے۔ چنانچہ ایک مقامی مشاعرہ میں جب آپ نے اپنی غزل کا مطلع پڑھا۔ تو حاضرین میں سے کسی من چلے نے آواز دی "صاحب ہمارے پاس لغت نہیں ہے۔ خود ہی شرح کر دیجئے" لیکن اسکے باوجود بعض دفعہ آپکا کلام انتہائی درجہ کا سادہ ہوتا ہے۔

انتخابِ کلام

درسِ عمل

اے قطرۂ بحر شناسائی اب جوش میں آ دریا بن جا
لنگر کو اُٹھا بن کشتی باں خود ساحلِ آب بقا بن جا

اے ذرۂ ارضِ حبِ وطن نا چیز نہ بن اعلیٰ بن جا
پامالِ قدومِ غیر نہ ہو تو نیترِ برجِ سما بن جا

اے آتشِ غیرت اور بھڑک تو دامنِ بادِ مخالف سے
گاہ صورتِ طورِ چراغاں ہو گہ شعلۂ جوالا بن جا

اے بادِ حمیت بن صرصر برباد خس و خاشاک کو کر
کر پاک اب صحن باغ جہاں گلچیں کے لئے کانٹا بن جا

پا پائی نیل جہاں کے لئے فرعون الدھر کا خوف نہ کھا
رہ ڈھونڈھ لے وادیٔ ایمن کی اُٹھ باندھ کمر موسیٰ بن جا

تو مرہمِ زخمِ جگر کیلئے منت کش چارہ ساز نہ ہو
شیدائی درد یہاں تک ہو خود آپ ہی اپنی دوا بن جا

ہے جورِ زمانہ حق میں ترے پیغامِ وصالِ محبوباں
ہستی کا رنگ جمانے کو ہمرنگِ برگِ حنا بن جا

کر خاک تمام یہ تخمِ ستم خرمن نہ رہے دہقاں نہ رہے
اُٹھنے میں شعلۂ آتش ہو گرنے میں برقِ فنا بن جا

ناصر جو ہے ذوقِ آزادی پھر کیوں ہے خوفِ اسیری کا
اسحاق و ظفر، یعقوب و امر اقبال و بقا و عطا بن جا



مہرؔ

(۱۸۹۵ء ــــــــــ)

مولانا غلام رسول مہرؔ ۱۴ اپریل ۱۸۹۵ء کو پھول پور ضلع جالندھر میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی اور ثانوی تعلیم جالندھر میں حاصل کی' اور بی۔اے اسلامیہ کالج ' لاہور سے پاس کیا۔ بی۔ اے کی سند حاصل کرنے کے بعد آپ حیدر آباد (دکن) میں انسپکٹر تعلیمات ہو کر چلے گئے۔ وہاں تین سال تک ملازمت کی۔ اس عرصہ میں مستقل طور پر اس جذبہ کی پرورش کرتے رہے کہ موقعہ ملے تو کسی ایسے اخبار کا اجرا کیا جائے' جو مسلمانوں کی فلاح و بہبود میں ممد ہو سکے لیکن اس جذبہ کی تسکین ریاست میں ممکن نہ تھی' اس لئے ملازمت چھوڑ کر واپس چلے آئے۔ دورِ ترکِ موالات میں جالندھر شہر میں خلافت کا کام کرتے رہے۔ اور بڑے پُرجوش کارکُن تھے۔

فروری ۱۹۲۲ء میں آپ بحیثیت ایڈیٹر' زمیندار' میں ملازم ہوئے۔ سالکؔ و مہرؔ' کا عہد زمیندار' اُردو صحافت کا ناقابلِ فراموش زمانہ ہے۔ زمیندار' کو اتنے کامیاب ایڈیٹر شاید ہی کبھی میسّر آئے ہوں۔ ۱۴ اپریل ۱۹۲۷ء کو سالکؔ اور مہرؔ نے

'زمیندار' سے علیحدہ ہو کر اپنا اخبار 'انقلاب' جاری کیا۔ جو ابھی تک ان دونو حضرات کی ادارت میں شائع ہو رہا ہے۔

سنہ ۱۹۳۰ء میں حضرت مہر نے سفر حجاز اختیار کیا۔ سنہ ۱۹۳۱ء میں یورپ تشریف لے گئے۔ اور سنہ ۱۹۳۴ء میں افغانستان گئے۔ اس سیاحت کے مجمل حالات 'انقلاب' میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ لیکن مستقل طور پر سفرنامہ لکھنے کی نہ مہر صاحب کو فرصت ہے اور نہ ہی شاید کبھی نصیب ہو۔

شاعری کا شوق بچپن سے تھا۔ بلکہ کہہ رہے تھے "میں سیاس تو ہرگز نہ تھا۔ حالات نے نثر نگاری پر مجبور کیا ورنہ میں تو آج تک یہی محسوس کرتا ہوں کہ مجھے شعر لکھنے کے لئے پیدا کیا گیا ہے" لیکن روزانہ اخبار کی ادارت کے فرائض کچھ اس قدر پیچیدہ اور گوناگوں ہیں۔ کہ مہر تقریباً تقریباً شعر کہنا ترک کر چکے ہیں۔

سیاسی مسائل کے عمیق مطالعہ نے چہرے پر بھی اپنے نمایاں اثرات ظاہر کئے ہیں یعنی آپ ہمہ تن متانت اور سنجیدگی نظر آتے ہیں۔ باتیں نہایت ہی متانت سے کرتے ہیں لیکن تکلف آمیز متانت سے نہیں بلکہ پُرخلوص اور واضح صداقت کے ساتھ۔

تصنیف

غالب : مستقل تصنیف صرف "غالب" ہے جس میں غالب کے سوانحِ حیات کو مولانا نے تاریخی لحاظ سے نہایت کاوش سے مرتب کیا ہے۔

حُسن

اے حُسن جو ہرِ دل کون و مکاں ہے تُو
جسمِ جہاں میں صورتِ روح رواں ہے تُو

شاداب ہے سرِشکِ وفا سے چمن ترا
پردوں سے سازِ کن کے بنا پیرہن ترا

قائم ترے وجود سے ہے بزمِ سوز و ساز
پوشیدہ نظمِ کون و مکاں کا ہے تجھ میں راز

پستِ جہاں ادائے سجودِ نیاز ہے
اے حُسن یہ تری ہی سراپا نماز ہے

برقِ نگاہ تیری نظر سوز دیدہ ہے
چشمِ آفریں حلقۂ جیبِ دریدہ ہے

قائم جہاں میں زینتِ ہستی تجھی سے ہے
گُل میں ہے بو، شراب میں مستی تجھی سے ہے

اس دورِ خیرہ چشم میں پوشیدہ ہو کے بیٹھ
عہدِ کہن کی جلوہ نمائی کو رو کے بیٹھ

غافل ہے تجھ سے محفلِ نو کی نگاہ دیکھ
اب عشق ڈھونڈھتا نہیں تیری پناہ دیکھ

یہ انجمن مٹی ہوئی جام و سبو پہ ہے
دستِ ہوس دراز تری آبرو پہ ہے

پہلی سی عشق میں وہ کہاں جاں گدازیاں
مل جائیں خاک میں نہ تری پاکبازیاں

چھوڑا ہے غزنوی نے وہ سوز و گداز آج
سوءِ ادب ہے عشوہ و ناز ایاز آج

سرجوشِ دردِ عشق کا دریا اُتر گیا
مجنوں و کوہکن کا زمانہ گزر گیا

ہوتا ہے آج غم میں ترے بیقرار کون
بنتا ہے اپنی آرزوؤں کا مزار کون

یہ انجمن ہے سرخوشِ کیفِ مئے فتور
ہاں اتیری رُخ نمائی کے قابل نہیں یہ طور

زلفِ طلب میں درد کا شانہ نہیں رہا
اے حُسن آہ ! تیرا زمانہ نہیں رہا

بس اب نہ چھیڑ تارِ ربابِ الست کو
بے نور چھوڑ چشمِ تماشا پرست کو

آزار دے نہ شیونِ غم بے سبب تجھے
کھینچے نہ کوہ و دشت میں ذوقِ طلب تجھے

بندِ قبائے صبح نہ کھولے ہوا تری
خورشید کا دیا نہ جلائے ضیا تری

خالی رہے شراب سے تیری سبوئے گل
جھونکا ہو اِک ہوا کا فقط موجِ بوئے گل

اِس غمکدے میں شمعِ تمنا جلا نہ تو
اُفتادگی کے خواب سے دل کو جگا نہ تو

مستورِ چشمِ دہر میں مثلِ نگاہ ہو
وہ دل نہیں رہا جو تری جلوہ گاہ ہو

گردِ ہوس ہے سُرمہ کشِ چشمِ روزگار
گم ہو کہ اِس پہ تیری حقیقت ہو آشکار

بے تاب پھر ہو عشق ترے اشتیاق میں
آباد کوہ و دشت ہوں تیرے فراق میں

کوزۂ سفال

اے کوزۂ سفال غریب الوطن ہے تو
سرگرمِ نالہ پاشیٔ رنج و محن ہے تو
تاراجِ کاوشِ غمِ ہجراں ہے گھر ترا
یادِ وطن میں چاک ہوا ہے جگر ترا
قسمت نے کر دیا تجھے گیتی خرابِ درد
معلوم کیا کسی کو ترا اضطرابِ درد
اس سرزمیں میں آہ! ترے غم میں روئے کون
دُرہائے اشک تارِ نظر میں پروئے کون
قسمت بگڑ گئی ہے مگر تن کے بیٹھ رہ
پہلو میں مہرِ خستہ کے دل بن کے بیٹھ رہ
ہاں ملکِ غیر میں دلِ فریاد رس نہ ڈھونڈھ
اس کاروانِ خفتہ میں بانگِ جرس نہ ڈھونڈھ

تو کربلائے یادِ عزیزاں کا ہے شہید
یا مجھ سیاہ بخت کی ٹوٹی ہوئی امید

بیٹھا ہوں آہ! میں بھی تری طرح بے وطن
میرے بھی دل میں درد کا طوفاں ہے موجزن
میری بھی چشمِ شوق ہے خوں نابہ بار آج
میرے بھی صبر کی ہے قبا تار تار آج

سر زیرِ ظلِ مہرِ عزیزاں نہیں رہا   آ اے اجل کہ زیست کا درماں نہیں رہا

صد جوشِ گل بہ دل رُخِ گلچیں شہ دیدہ ہوں

"میں موسمِ بہار میں شاخِ بریدہ ہوں"

آ اے ستم نصیب کہ مل کر رہیں یہاں   اک دوسرے سے دردِ تمنا کہیں یہاں

عزمِ ستم فروشیٔ گردوں کو توڑ دیں   آئینہ سازِ بخت کے افسوں کو توڑ دیں

سرمشقِ کج ادائی اہلِ وطن ہوں میں

اے کوزۂ سفال غریب الوطن ہوں میں

یہ نظم آپ نے سفرِ حجاز کے دوران میں لکھی تھی۔



تپشؔ

(۱۸۹۵ء ———)

شیخ عبداللطیف صاحب تپشؔ ۲۹؍ اکتوبر ۱۸۹۵ء کو پیدا ہوئے۔ وطن لاہور ہے۔ تعلیم تقریباً تمام لاہور ہی میں ہوئی۔ منشی فاضل اور بی۔ اے کا امتحان پاس کرنے کے بعد آپ نے کچھ عرصہ تک پنجاب یونیورسٹی میں ملازمت کی۔ اور پھر گورنمنٹ کالج، پسرور میں السنۂ شرقیہ کے پروفیسر ہو کر چلے گئے۔ یہیں سے آپ نے ایم۔ اے (فارسی) کا امتحان دیا، پنجاب یونیورسٹی میں اوّل آئے، اور سونے کا تمغہ حاصل کیا۔ اِس وقت آپ گورنمنٹ ایمرسن کالج، ملتان میں السنۂ شرقیہ کے نہائت کامیاب پروفیسر ہیں۔

تپشؔ نہائت زیرک اور ملنسار دوست ہیں۔ ادبی ذوق کے حامل ہونے کے باعث کالج میں ہر دلعزیز ہیں۔ شعر و شاعری سے بچپن سے لگاؤ ہے۔ غزل گوئی کی طرف رُجحان زیادہ ہے۔ ابتداءً پُرگوئی کے شائق تھے۔ لیکن کثرتِ مشق

اور پختہ گوئی کا یہ اثر ہوا ہے کہ اب گاہے گاہے شعر کہتے ہیں۔ چنانچہ جہاں ملک کے تمام ادبی رسائل آپ کے اشعار سے متمتع ہوتے تھے۔ اب صرف 'معارف' یا اسی معیار کے ایک دو اور رسائل میں آپ کے اشعار نظر آتے ہیں۔

انتخابِ کلام

دُنیا

نقش بر روئے آب ہے دُنیا — چشم بیدار اخواب ہے دُنیا
مختصر ہے فسانۂ ہستی! — اک ورق کی کتاب ہے دُنیا
مددِ لے پردہ دارِ بزم شہود — شاہدِ بے نقاب ہے دُنیا
ہر حکایت ہے جس کی شورش خیز — اُس گلستاں کا باب ہے دُنیا
سرد بازاریٔ تمنا حیف — مثلِ جوشِ شباب ہے دُنیا
ہم نوائی خامشی معلوم — لفظِ کُن کا جواب ہے دُنیا
کھا نہ جائے کہیں نگاہِ فریب — اے مسافر سراب ہے دُنیا

موت آتی نہیں ترسے پینے کی / یہ سزا مل رہی ہے جینے کی

مے سے پرہیز شیخ توبہ کرو / اک یہی چیز تو ہے پینے کی

تمہیں کہتا ہے آئینہ خودبیں / باتیں سنتے ہو اِس کمینے کی

ہوگیا جب سے بے نقاب کوئی / شمع روشن نہ پھر کسی نے کی

چشمِ تر آبرو تو پیدا کر / یُوں نہیں بجھتی آگ سینے کی

اہلِ دُنیا سے کیا بدی کا گلہ
اے تپش تو نے کس سے کی نیکی

جانِ بلب رسیدہ پر حصرِ کشود کار کیا / دے گی نوید زندگی مرگِ امیدوار کیا

لنگرِ کشتیٔ حیات پا بہ ہوا ہے بے ثبات / سانس کی کُل ہے کائنات سانس کا اعتبار کیا

ہوتی ہے باز پُرس کیوں ربطِ نیاز و ناز کی / عہدِ الست کو پھر آج کرتے ہو استوار کیا

سازِ قدر قضا میں ہے رازِ فنا بقا میں ہے / فطرتِ مستقل کو دیکھ ہستیٔ مستعار کیا

بے سر و پائے شوق کو مدِ نظر ہیں وحشتیں / حُجتِ سنگِ راہ کیوں شکوۂ نوکِ خار کیا

بند ہیں لب، ہوا کریں، چشم ہے، اُبلا سے ہو / بھید ہے اِس میں کونسا کرتے ہو آشکار کیا

مرگِ غریب کی تپش کون وطن میں دے خبر
اپنوں کا اعتبار کیا، غیر پہ اختیار کیا

کیفِ نصر زہرۂ غربت وطن میں ہے
لطفِ بہار رنگ پریدہ چمن میں ہے

سر پھوڑتا ہے قطعِ رہِ عشق کے لئے
یہ کس بلا کا شوق دلِ کوہکن میں ہے

اندیشۂ شکستِ دل و سر بجیبِ شوق
اب کونسی کسر ترے دیوانہ پن میں ہے

ہے کون جلوہ گر مری آنکھوں میں دیکھنا
خلوت کدہ کسی کا مری انجمن میں ہے

پھر مدعی ہوا ہدفِ ناوکِ نظر
پھر اک خلش نئی مرے زخمِ کہن میں ہے

دلسوزیاں کلام میں ہیں میرے لئے تپش
گویا زبان سوختہ میرے دہن میں ہے

وہ جو آنکھیں جھکائے جاتا ہے
اک قیامت اُٹھائے جاتا ہے

جلوۂ رُخ دکھائے جاتا ہے
یعنی بجلی گرائے جاتا ہے

بزمِ دشمن ہیں ہم سے بچ بچ کر
کون یہ منہ چھپائے جاتا ہے

اپنا بھی امتحان کر قاتل!
تیغ کیوں آزمائے جاتا ہے

جس قدر وہ بگڑتے ہیں یہ دل
مجھ سے باتیں بنائے جاتا ہے

رو رہا ہوں میں اپنی حالت پر
اور وہ مسکرائے جاتا ہے

انکی محفل میں دیکھنے ہو تپش
رنگ اپنا جمائے جاتا ہے

جلوۂ بت خانۂ ظلمات ہوں ‏ پردہ بردارِ طلسمِ ذات ہوں

تلخ کامی ہائے ہستی کیا کہوں ‏ میں حریصِ فتنۂ لذات ہوں

نیشِ غم ہو کیوں نہ لذت آفریں ‏ جرعہ نوشِ بادۂ ہیہات ہوں

خاکساری بھی ہے میری جلوہ ریز ‏ آفتابِ عالمِ ذرات ہوں

ہے بقا مصروفِ اندوہِ فنا ‏ یادگارِ منفی و اثبات ہوں

میری بے قدری نہ کر اے کج نظر ‏ دور کی بھیجی ہوئی سوغات ہوں

انتشارِ طبع کیا کہئے تپش

مدتوں سے موردِ آفات ہوں

کھل گیا پردہ جنوں کا دل کے ٹکڑے کر دیئے

اضطرابِ شوق نے محمل کے ٹکڑے کر دیئے

کشتۂ ناکام کی اللہ رے گستاخیاں

اک تڑپ میں خنجرِ قاتل کے ٹکڑے کر دیئے

ہو گیا ثابت فریبِ چشم پوشیٔ کلیم

ہوش کھو کر پردۂ حائل کے ٹکڑے کر دیئے

مد و جزر بحرِ ہستی کا نہیں کچھ اعتبار
جب ذرا موج آ گئی ساحل کے ٹکڑے کر دیئے

اُس کا صدقہ جوڑ دے یارب یہ دل ٹوٹا ہوا
جس کی خاطر سے مہ کامل کے ٹکڑے کر دیئے

اے تپشؔ طوفانِ استغنا کے صدقے جائیے
کشتیٔ دریوزۂ ساحل کے ٹکڑے کر دیئے

موجِ سراب اشک ہے دریا کہیں جسے
دامانِ دل ہے دامنِ صحرا کہیں جسے

وُہ پابگل ہے تارکِ دُنیا کہیں جسے
مغرورِ گیر و دار ہے رُسوا کہیں جسے

صحرائے لق و دق ہے تمنا کہیں جسے
طوفانِ غم ہے اشک کا قطرہ کہیں جسے

سرمایۂ غشی ہے وُہ جلوہ کہیں جسے
صبر آزمائے شوق ہے پردہ کہیں جسے

اندھیر کیوں نہ ہو کہ فراموش گار ہے
یادش بخیر گھر کا اجالا کہیں جسے

ہاں سوزِ ہجرِ یار کوئی معجزہ دکھا
دل میں وُہ داغ ہو یدِ بیضا کہیں جسے

جیتا ہوں اُس کے وعدۂ فردا پہ آج تک
دم بھی دیا تو وُہ دمِ عیسےٰ کہیں جسے

نافہ ہے عشق گردِ رہِ ناقۂ قیس ہے
طرہ ہے اُس کی زلف کا لیلےٰ کہیں جسے

مرگِ بہانہ ساز ہے فرقت ہے جسکا نام   جانِ شہیدِ غم ہے تمنا کہیں جسے
جامِ جہاں نما ہے پئے گردشِ مدام   وہ چشمِ مست غیرتِ مینا کہیں جسے
سوزِ غمِ فراق سے جلتا ہوں اے تپشؔ
موت آئے یاد وہ آئے مسیحا کہیں جسے



یوسف

(ـــــــــــ ۱۸۹۶ء)

میاں محمد یوسف صاحب یوسف میاں دین محمد صاحب کے صاحبزادے ہیں۔ آبا و اجداد کا وطن مالوف گجرات ہے۔ ان کی پیدائش بھی ۱۳ نومبر ۱۸۹۶ء کو یہیں پر ہوئی۔ ابتدائی تعلیم مشن ہائی اسکول گجرات میں پائی۔ بعد میں اردو اور فارسی کی ابتدائی کتابیں مختلف اصحاب سے پڑھیں۔ اور خانگی طور پر علمی لیاقت کافی بڑھالی۔

ابتدائے شعور سے فکرِ معاش دامنگیر ہوئی۔ تو گجرات میں بزازی کی دکان کھولی۔ کچھ عرصہ تک دکان کافی کامیابی کے ساتھ چلاتے رہے لیکن دن بدن علمی مشاغل بڑھتے گئے۔ اور ادبی انہماک زیادہ ہوتا گیا۔ دکان اِس بارِ عظیم کو برداشت نہ کرسکی۔ کیونکہ توجہ کی یہ تقسیم کاروبار کو گوارا نہیں ہوتی۔ مجبوراً حضرت یوسف کو ۱۹۲۷ء میں یہ کاروبار چھوڑنا پڑا۔

دکان بند کرنے کے بعد آپ نے سیاحت شروع کی۔ اس سیاحت سے تجارت سے کچھ مزید واقفیت پیدا کرنا بھی مقصد تھا۔ چنانچہ "ملکِ خدا تنگ نیست" سمجھ کر آپ ہندوستان کے مختلف کونوں میں سیر کرتے ہوئے پہنچے۔ کاروبار تو خیر جو کرنا تھا وُہ کیا لیکن اس طرح آپ نے اُس ذوقِ حیات کی تشنگی کا سامان ضرور بہم پہنچایا۔ جو عرصہ سے آپکے دل میں چٹکیاں لے رہا تھا۔ اس دوران میں آپ نے کشمیر اور دیگر مقامات پر چند نظمیں لکھی ہیں جن کا انتخاب درج کیا گیا ہے۔

سیاحت کا جنوں پُورا کرنے کے بعد آپ پھر گجرات لوٹ آئے۔ اور اب پتھر کے کوئلہ کی تجارت میں مصروف ہیں۔

آپ کی شاعری کی ابتدا ۱۹۱۷ء میں ہوئی۔ گجرات میں مرزا ارشد گورگانی مرحوم کے شاگرد مرزا نثار حسین منتصر بسلسلۂ ملازمت مقیم تھے۔ حضرتِ یوسف نے اصلاح کے لئے ان کی طرف رجُوع کیا۔ اور اُنکے حلقۂ تلمذ میں شامل ہو گئے بعد میں کچھ عرصہ تک بذریعہ خط و کتابت مولینا سیماب اکبرآبادی سے بھی اصلاح لیتے رہے۔ لیکن کلام میں پختگی پیدا ہونے پر اصلاح سے بے نیاز ہو گئے۔

آپ کا کلام ملک کے مقتدر جرائد "نگار" "ہمایوں" "ادبی دنیا" "نیرنگِ خیال" اور عالمگیر وغیرہ میں شائع ہو کر اہلِ ذوق سے خراجِ تحسین وصول کرتا رہا ہے

مرنجاں مرنج انسان ہیں۔ اور طبیعت میں استغنا۔ اور توکل بدرجۂ اتم موجود ہے۔ آج کل کاروباری مصروفیات کی زیادتی کی وجہ سے بہت کم شعر کہتے ہیں۔ آپ کا اسلوبِ بیان نہایت سادہ اور دلکش ہوتا ہے۔ تراکیبِ نادرہ سے نفرت کرتے ہیں۔ البتہ صداقتِ بیان انہیں بہت مرغوب ہے۔

تصانیف

۱۔ **کلامِ یوسف** ۔ یہ حضرتِ یوسف کے اُس کلام کا مجموعہ ہے۔ جو آپ نے ۱۹۲۱ء تک کہا ہے۔

۲۔ **گنجینۂ قوافی** ۔ اس میں کئی ہزار قوافی ردیف وار جمع کئے گئے ہیں یہ تالیف شعرا کے لئے مفید ہے۔

اِنتخابُ کلام

عینِ ہستی تھی عدم کی نیستی میرے لئے
موت کا پیغام لاتی زندگی میرے لئے

غیر ممکن ہے کہ ہو پیدا خوشی میرے لئے
میں غمی کیواسطے ہوں اور غمی میرے لئے

المدد اے دستِ باسط مثلِ عنقا ہوگئی　　تنگ نائے دہر میں آسودگی میرے لئے

حورِ جنت کی ستائش دینِ واعظ ہے مگر　　اصل ایماں ہے یہ بزمِ کافری میرے لئے

حُسن والوں نے کیا دامِ محبت میں اسیر
باعثِ عزت ہے اسوہ یوسفی میرے لئے

حصولِ مقصدِ یوسفؔ سراسر دل کا دھوکا ہے
نظر کو ضعف سے ہر گام پر منزل کا دھوکا ہے

سراسیمہ کیا ہے اس قدر طوفانِ ہستی نے
مجھے ہر موجِ دریا پر لبِ ساحل کا دھوکا ہے

جنوں میں عشقِ لیلےٰ نے کیا ایسا اثر پیدا
غبارِ دشت پر بھی قیس کو محمل کا دھوکا ہے

ثنا خوانی کیا کرتا ہے جس جنت کی اے واعظ
مگر یوسفؔ کو اپنے یار کی محفل کا دھوکا ہے

ذرا وہ حُسن کو اپنے چھپا کے دیکھ تو لیں　　اور پہلے حشر سے محشر اٹھا کے دیکھ تو لیں

کریں گے عکس کو جوہرِ عطا تکلم کے مگر وہ آئینہ رُخ کو بنا کے دیکھ تو لیں

کہاں کلیم، کہاں طور، اور کہاں یوسفؔ
وُہ برق سوز نگاہیں اُٹھا کے دیکھ تو لیں

جفاؤں پر جفا ہے اور میں ہوں دلِ صبر آشنا ہے اور میں ہوں
گئے وہ دن کہ شکوے تھے جہاں کے اب اپنا ہی گلہ ہے اور میں ہوں
ہزاروں آرزوئیں تھیں مگر اب دلِ بے مدعا ہے اور میں ہوں

اثر ہے لذتِ بیداد کا یہ تمنائے جفا ہے اور میں ہوں
پہنچتی تھی کبھی عرشِ بریں تک اب آہِ نارسا ہے اور میں ہوں
سہارے ہو چکے سارے جہاں کے خدا کا آسرا ہے اور میں ہوں
اٹھائے رنج دنیا کے نہیں یوسفؔ
غمِ روزِ جزا ہے اور میں ہوں

ساقی تری نگاہ نے مستانہ کر دیا — دل ایک جام تھا جسے میخانہ کر دیا
کیفِ شرابِ حسن کی یہ طرفہ کاریاں — دیوانہ کر دیا کبھی فرزانہ کر دیا
برقِ جمالِ یار کا انداز دیکھنا — دلِ غیرتِ بہار تھا ویرانہ کر دیا
مدِ نظر وقارِ حرم تھا تو اے خدا — کیوں گلفشاں سوادِ صنمخانہ کر دیا
ساقی کی چشمِ مست میں دیکھا جو کیفِ حسن — دل ہم نے وقفِ بادہ و پیمانہ کر دیا
دیکھا جو آسمان پہ ابرِ بہار کو — رندوں نے ایک نعرۂ مستانہ کر دیا

یوسف مآلِ عشق زلیخائے مصر نے
عالم میں خوابِ حسن کو افسانہ کر دیا

دیدنی ہے ترے جمال کا رنگ — حسن اور حسنِ بےمثال کا رنگ
چشمِ مخمور کے تصور نے — کیف زا کر دیا خیال کا رنگ
حسن جلوہ فروز دل میں رہا — دیکھئے شوقِ لازوال کا رنگ
کھو گئے طور پر کلیم اللہ — اللہ اللہ ترے جمال کا رنگ

موج میں آگیا ہے بحرِ کرم
دیکھ کر میرے انفعال کا رنگ

سیرِ کوہسار

کیفِ بیخودی سے مست کوہ کی بلندیاں
جاذبِ نگاہ ہیں بلندیوں سے پستیاں

سبزہ زار سے تمام کوہ سبز پوش ہے
عشرتِ بہار سے نسیم گلفروش ہے

وجد میں ہیں آبشار بارشِ خمار سے
ایک کیف بہ رہا ہے حُسنِ جوئبار سے

پُر بہار وادیوں میں بادلوں کا جھومنا
شوقِ رفعت آفریں سے آسماں کو چُومنا

خم بہ خم لنڈھا رہا ہے ابر مے فشار کیا
عالمِ سرور میں ہے شوخیٔ بہار کیا

کتنے وجد آفریں ہیں نغمہائے آبشار
یعنی محفلِ سرود ہے فضائے کوہسار

حُسنِ آفتاب کو پسند چادرِ سحاب
ضوفشانیاں کرے قمر مگر تہ نقاب

حُسن کی لطافتوں میں غرق منظرِ سحر
موجِ نور سے ہو جیسے ماہتاب تربتر

کیفہائے خامشی سے مست رنگِ شام ہے
رات کی مسرتوں کے واسطے پیام ہے

ہر درخت پر سکوت برگ و بار پر سکوت
یعنی چھا گیا ہے سارے کوہسار پر سکوت

دامنِ خیال ہے کہ سیر گاہِ حُسن ہے
منزل نشاط ہے یا کیف گاہِ حُسن ہے

سنگلاخ وادیوں میں حُسن سجدہ ریز ہے
مستیٔ بہار سے نسیم عطر بیز ہے

ہے بہار پر نکھار اور نکھار پر بہار
رشکِ جنتِ بہار بن گیا ہے کوہسار

نشاط باغ (کشمیر)

جلوہ ہائے حُسن سے رنگیں ہے تعمیرِ نشاط
چشمِ نظارہ کو عشرت خیز تصویرِ نشاط

دیدنی ہے ہر روش پر لالہ و گل کی بہار
رنگ و بُو سے ہوگئی دوچند تنویرِ نشاط

پتا پتا اس چمن کا گلشنِ فردوس ہے
گلشنِ فردوس کیا ہے ایک تفسیرِ نشاط

کر رہی ہے گُل فروشی کس تکلف سے نسیم
یعنی ہر انداز سے پیدا ہے تشہیرِ نشاط

غرق کیفِ سرمدی میں ہے خرامِ جوئبار
اس کی ہر اک موج سے روشن ہے تصویرِ نشاط

کس قدر فرحت فزا ہے سبزہ و گل کا سکوت
ہے تصدق اس کی خاموشی پہ تقریرِ نشاط

یوں تو ہر ذرّہ میں گلشن کے ہیں شانِ دلکشی

حُسن فوارہ نے کر دی اور توقیرِ نشاط

دل لئے جاتا ہے ہر تختے کا حُسنِ دلنشیں

گویا ہر تختہ مجسّم ہے تقاضائے نشاط

حُسن بے پردہ کی رنگینی ہے کیسی دلفریب

جس کے جلووں سے چمک اٹھی ہے شمعِ بزمِ نشاط

کس قدر اُلفت مسرّت کو ہے اسکے نام سے

ہاں رہے محفوظ یارب گردشِ ایام سے

چناب پر ایک شام

جبکہ دورِ آفتاب کا تمام ہو چکا ۔۔۔ عشرتِ شفق کا رنگ زرد فام ہو چکا

شورشیں جہان کی ہو گئیں سکوت میں فنا ۔۔۔ محفلِ جہاں پہ رنگ مستیوں کا چھا گیا

گم ہوئے خموشیوں میں زمزمے طیور کے ۔۔۔ آ رہے نشیمنوں میں شام کے ظہور سے

سطحِ ارض پر درخت یوں خموش ہیں کھڑے ۔۔۔ جیسے کوئی رندِ لم یزل ہو مست بن پیے

ہر بلند و پست پر ہے اک جہاں کا سکوت ۔۔۔ گویا چھا گیا زمیں پہ آسمان کا سکوت

کیفِ خامشی سے ہوگیا ہے مست رنگِ شام
وہ لطافتوں کا جوش وہ نسیم کا خرام

ہیں لبِ چناب پر جو اس قدر خموشیاں
داستانِ حُسن و عشق کا مگر ہے رازداں

غرق بے خودی میں ہیں روانیاں چناب کی
یعنی بہ رہا ہے ایک حُسن کیف پروری

وہ نمودِ انجمِ فلک مگر کہیں کہیں
خاتمِ اُفق میں ضو فشاں ہیں صورتِ نگیں

وُہ اِدھر اُدھر خرام مچھلیوں کا آب میں
گویا حسن گلفشاں ہے رنگِ اضطراب میں

کس قدر سرور خیز ہے یہ منظرِ حسیں
کیا ہی فطرتِ جمیل کا ہے حُسنِ دلنشیں

شام کے سکوت سے عیاں ہے رات کا فسوں
جسکے عکس سے فضا بنی ہوئی ہے نیلگوں

رونقِ جمال اب تو وقفِ رات ہوگئی
یعنی پردہ ہائے شب میں کائنات سوگئی

ہاں سوائے تیرگئ شب نہیں ہے ہم نشیں
تو بھی درد سے لپٹ کے سو جا اے دلِ حزیں



حفیظ جالندھری

۱۸۹۹ء (_________)

خانصاحب ابوالاثر حفیظ جالندھری ۱۸۹۹ء میں جالندھر میں پیدا ہوئے تذکرۃً ایک دن راقم نے تاریخِ ولادت پوچھی تو کہنے لگے :۔ "صحیح تاریخ تو یاد نہیں لیکن مہینہ غالباً رمضان کا ہوگا کیونکہ فاقے بہت کرنے پڑے ہیں" آپ کی ابتدائی تعلیم بھی جالندھر میں ہوئی۔ بہت چھوٹی عمر میں ملک الشعراء شیخ غلام قادر گرامی مرحوم کی صحبتیں نصیب ہوئیں۔ اور جوانی میں اُن کے مشفقانہ مشوروں سے بھی فیضیاب ہوئے یہی مشورے بیشتر آپ کے ذوقِ شعری کی تربیت میں ممد ہوئے کچھ عرصے تک مختلف حیثیتوں سے کاروباری زندگی بسر کرتے رہے، لیکن اِس زندگی کی بے پناہ مشقتوں سے اپنی صحت سے ہمیشہ کے لئے ہاتھ دھو بیٹھے اور آخرکار اس پیشہ کو ترک کر کے لاہور چلے آئے۔ یہاں دارالاشاعت پنجاب میں "پھول" کے مدیر کی حیثیت سے ملازم ہو گئے۔ مذاقِ سلیم فطری تھا۔ دارالسلطنت کے

مختلف جرائد میں ان کی نظمیں شائع ہوئیں اور دارالاشاعت پنجاب میں فرائض ادارت ادا کرنے کے علاوہ آپ نے بچوں کے لئے کئی مفید کتابیں لکھیں۔ لیکن جب حفیظ کی جدتوں کو عوام الناس کے سامنے رونمائی کرنے کا موقعہ ملا۔ تو حفیظ خرد و کلاں کے محبوب شاعر بن گئے۔ کلام کا سادہ پن اور حفیظ کا ترنم دو اس قدر قوی جادو تھے کہ انکے مقابلے پر عصر حاضر کے شعرا کے کلام کی تمام خوبیاں ماند پڑ گئیں۔ شائد یہ نہ کہا جا سکے کہ حفیظ اپنے زمانے کا بہترین شاعر ہے۔ لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ حفیظ اپنے زمانے کا مقبول ترین شاعر ہے۔ بڑے بڑے مشاعروں، قومی اور ملی اجتماعات میں حفیظ کا نام ساحر کی طرح لوگوں کو شرکت کے لئے آمادہ کرتے ہوئے دیکھا گیا ہے۔ نحیف و نزار انسان جب سٹیج پر کھڑا ہو کر ہمہ تن اپنی شاعری کی روح کی نمائندگی کر رہا ہوتا ہے تو بے اختیار لوگوں کے منہ سے کلماتِ تحسین نکل جاتے ہیں۔

ابوالاثر کی مقبولیت کی ابتدا اُس کی جدید نظموں سے ہوئی اور انتہا اُس کے اُس کارنامے سے ہوئی جس کی نظیر شائد کئی سال تک معرضِ ظہور میں نہ آئے۔ یہ اُس کی تصنیف شاہنامۂ اسلام ہے جس میں تاریخ اسلام کو نظم کیا گیا ہے حفیظ نے اِس سے پہلے بھی بہت نظمیں لکھیں اور بعد میں بھی لکھے گا لیکن

ایسی سعادت اُسے کبھی نصیب نہ ہوگی۔ افسوس ہے کہ صحت کی خرابی کی وجہ سے یہ تصنیف مکمل نہیں ہوسکی لیکن حفیظ ابھی تک رجائیت پسند ہے۔ کیا عجب یہ کہ تصنیف مکمل ہو ہی جائے۔

حفیظ مخلص دوست اور دوست نواز آدمی ہے ۱۹۳۴ء میں خانصاحب کا خطاب ملا تھا لیکن ابوالاثر کی بجائے خانصاحب کہلانا پسند نہیں کرتا بے تکلفی شعار ہے۔ شاید اِس قدر مقبول ہونے کی یہ بھی ایک وجہ ہے۔

تصانیف

۱۔ ہفت پیکر۔ سات معاشری افسانوں کا ایک مجموعہ ہے جس میں مصنف نے ہماری معاشرتی زندگی کے کئی پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔

۲۔ نغمہ زار۔ ابتدائی غزلوں اور نظموں کا مجموعہ ہے۔

۳۔ شاہنامۂ اسلام۔ تاریخ اسلام کی مسلسل اور نہائت دلکش مثنوی ہے۔ اس کے دو حصے شائع ہو چکے ہیں۔

۴۔ سوز و ساز۔ غزلوں اور نظموں کا دوسرا مجموعہ ہے۔

۵۔ بچوں کے لئے آپ نے کئی چھوٹی چھوٹی کتابیں لکھی ہیں لیکن حال ہی

میں وہ بچوں کے لئے نظموں کا ایک مجموعہ ترتیب دے رہے ہیں، جو نہائت مفید تصنیف ہے۔

۶۔ ہندوستان کا بلند پایہ ادبی رسالہ مخزن تیسری اور آخری مرتبہ آپ کی ادارت میں دو اڑھائی سال نہائت کامیابی سے شائع ہوتا رہا۔ پھر اس کے مالکوں نے کسی مصلحت کی بنا پر اُسے بند کر دیا۔

انتخابِ کلام

عیدِ میلادُ النبی

زندگی مُردہ تھی رُوح زندگی افسردہ تھی
خامئی تخلیق اپنے آپ سے آزردہ تھی

جلوے افسردہ تھے اپنی خامئی تخلیق سے
عشق تھا رُو پوش اب تک حُسن کی قندیل سے

سازِ فطرت تھا ابھی مضراب سے ناآشنا
نغمہ تھا اِک لذتِ بیتاب سے ناآشنا

سو رہی تھی کامرانی خواب کے آغوش میں
آرزوئیں دم بخود تھیں حسرتِ خاموش میں

باغ سے موجِ شمیم جانفزا اٹھتی نہ تھی
نالۂ جانکاہِ بلبل کی صدا اُٹھتی نہ تھی

آنکھ تھی لیکن ابھی تک اشک سے محروم تھی — کامیابی کی تمنا رشک سے محروم تھی
روح نے اب تک دعاؤں کے مزے پائے نہ تھے — خامشی نے التجاؤں کے مزے پائے نہ تھے

عالمِ ایجاد تھا، کچھ اس طرح یعنی نہ تھا
آفرینش لفظ تھا شرمندۂ معنی نہ تھا

یک بیک اُمید کے گھر میں خوشی پیدا ہوئی — زندگی کے واسطے اِک زندگی پیدا ہوئی
سینۂ ہستی میں کروٹ لی دلِ بیتاب نے — پڑھ لیا یعنی حرارت کا سبق سیماب نے
روئے فطرت پر محبت کی ضیا پیدا ہوئی — حُسن کی آنکھیں جھکیں اُن میں حیا پیدا ہوئی
ناگہاں ساکن ہواؤں میں روانی آگئی — اور چمن کے پتے پتے پر جوانی آگئی
سینۂ غنچہ میں اِک میٹھی کسک پیدا ہوئی — گل میں خوشبو اور شاخوں میں لچک پیدا ہوئی
سبزۂ خوابیدہ جاگا لہلہانے کے لئے — ہوگئیں بیتاب کلیاں مسکرانے کے لئے

آج زانوئے ازل پر صبح نے انگڑائی لی
مُسکرا کر اِک کرن نے ہاتھ میں شہنائی لی

غُل ہوا دُنیا میں ختم المرسلیں پیدا ہوا — مخزنِ اسرارِ قدرت کا امیں پیدا ہوا
کشتیٔ ارض و سما کا ناخدا پیدا ہوا — ابتدا و انتہا کا پیشوا پیدا ہوا
عرش پر سے شادیانوں کی صدا آنے لگی — سازِ الفت کے ترانوں کی صدا آنے لگی

فرش پر روح الامیں آتے لگے جانے لگے
طائرانِ قدس نغمے نعت کے گانے لگے

دھیمے دھیمے رس بھرے نغمے ہوا میں بھر گئے
میٹھے میٹھے گیت حوروں کے فضا میں بھر گئے

بھر گیا آکر فضا میں لشکرِ نورانیاں
اور پیشِ نورِ مطلق جھک گئیں پیشانیاں

پر فرشتوں کے کھلے انوار لہرانے لگے
نور کے بادل زمیں پر پھول برسانے لگے

کعبۂ توحید پر رکھ کر جبیں سات آسماں
جھک گئے تعظیم کو پیشِ زمیں سات آسماں

تھی یہ صبحِ زندگی تمہیدِ میلادالنبی
آپ خالق نے منائی عیدِ میلادالنبی

ساقی نامہ

فضاؤں پر مسلط لشکرِ جنات ہے ساقی
قیامت خیز طوفاں ہے اندھیری رات ہے ساقی
اُٹھی ہے لعنتی تہذیبِ نو سیلاب کی صورت
ہے جس کے حلقۂ ہر موج میں گرداب کی صورت
تلاطم خیز موجیں ہیں گناہوں کے تھپیڑے ہیں

الٰہی خیر ہو ایمان کے کمزور بیڑے ہیں

ہوائے شیطنت کمزور بیڑوں کو ڈبوتی ہے

مگر اولادِ آدم تختۂ غفلت پہ سوتی ہے

میں انسانوں کو اس طوفانِ ذلت سے بچاؤں گا

میں ان سوئے ہوئے شیروں کی غیرت کو جگاؤں گا

وہی ضیغم جو تیرہ سو برس پہلے دہاڑے تھے

وہی پنجے جو حق نے سینۂ باطل میں گاڑے تھے

مجھے اُن کو اٹھانا ہے مجھے اُن کو جگانا ہے

پُرانی گونج سے غوغائے باطل کو مٹانا ہے

پلا ساقی، پلا وہ شعلۂ صہبائے ایمانی

کہ اڑ جائیں دھواں بنکر وساوسہائے شیطانی

دہانِ خانہ میں ٹپکا وہ بادہ اپنے ساغر سے

کہ جس کا قطرہ قطرہ تازیانوں کی طرح برسے

شرابِ معرفت کا از سرِ نو جام بھر ساقی

رگوں میں پھر پرانا آتشیں اسلام بھر ساقی

مجھ کو پلا ساغر اُسی صہبائے وحدت کا
کہ جس کی موج سے منہ پھیر دوں ہر فوج کثرت کا
مئے توحید کہنہ کا اُٹھا سربستہ خُم ساقی
سُنا مردہ دلوں کو پھر وہی آواز قُم ساقی
مری فطرت کو ساقی بے نیازِ دو جہاں کر دے
پیالہ سامنے دھر دے، قلم میں زندگی بھر دے
زمانے میں نہیں مقصود میرا جز خدا کچھ بھی
مرے مُنہ سے نہ نکلے گا صداقت کے سوا کچھ بھی

(از شاہنامۂ اسلام)

دِل ہے پرائے بس میں

(گیت)

پُورب میں جاگا ہے سویرا دُور ہوا دُنیا کا اندھیرا

لیکن گھر تاریک ہے میرا

پچھم میں جاگی ہیں گھٹائیں — پھرتی ہیں سرمست ہوائیں

جاگ اُٹھو میخانے والو — پینے اور پلانے والو

زہر ملاؤ رس میں

دل ہے پرائے بس میں

باغ میں بلبل بول رہی ہے — نرگس آنکھیں کھول رہی ہے

شبنم موتی رول رہی ہے

آم پہ کوئل کوک اُٹھی ہے — سینے میں اک ہوک اُٹھی ہے

بن جاؤں نہ کہیں سودائی — جانوروں کی رام دُہائی

چبھتی ہے نس نس میں

دل ہے پرائے بس میں

بیت گیا دن رات بھی آئی — تاروں نے محفل بھی سجائی

اُس نے مگر صورت نہ دکھائی

وہم کئی ٹالے ہیں میں نے — تارے گن ڈالے ہیں میں نے

وعدے کا تو کس کو یقیں ہے — آنکھ میں لیکن نیند نہیں ہے

نیند نے کھالیں قسمیں

دِل ہے پرائے بس میں

لوگو چھوڑو دُنیا داری　　جان گیا اُلفت میں تمہاری

تہ کر دو یہ نصیحت ساری

مُجھکو تم سے کام ہی کیا ہے؟　　میرا ننگ و نام ہی کیا ہے؟

اِس دُنیا کی پریت یہی ہے　　رسم یہی ہے ریت یہی ہے

ٹوٹ گئیں سب رسمیں

دل ہے پرائے بس میں

کون بتائے الفت کیا ہے　　دل کیا دل کی حقیقت کیا ہے

مر مٹنے میں لذت کیا ہے

بے درد اس کو کیا پہچانے　　جس پر بیتی ہو وُہ جانے

دیکھ اے گیانی۔ دُنیا ہے فانی　　ہائے محبت۔ ہائے جوانی

آگ لگی ہے خس میں

دِل ہے پرائے بس میں

دوستو اُس کا نام نہ پوچھو　　کچھ بھی نہیں ہے کام نہ پوچھو

اِسکے سوا پیغام نہ پُوچھو

میرا بھی تم نام نہ لینا ۔۔۔ مل جائے تو یُوں کہہ دینا

اِک دیوانہ چُپ رہتا ہے ۔۔۔ کہتا ہے تو یہ کہتا ہے

دل ہے پرائے بس میں

دل ہے پرائے بس میں

پریت کا گیت

اپنے من میں پریت

بسا لے

اپنے من میں پریت

من مندر میں پریت بسالے ۔۔۔ او مُورکھ او بھولے بھالے

دل کی دُنیا کر لے روشن ۔۔۔ اپنے گھر میں جوت جگا لے

پریت ہے تیری ریت پُرانی ۔۔۔ بھُول گیا او بھارت والے

بھُول گیا او بھارت والے

پریت ہے تیری ریت

بسالے

اپنے من میں پریت

کرودھ کپٹ کا اترا ڈیرا   چھایا چاروں کونٹ اندھیرا
شیخ برہمن دونوں رہزن   ایک سے بڑھ کر ایک لٹیرا
ظاہرداروں کی سنگت میں   کوئی نہیں ہے سنگی تیرا

کوئی نہیں ہے سنگی تیرا
من ہے تیرا میت
بسالے
اپنے من میں پریت

بھارت ماتا ہے دُکھیاری   دکھیارے ہیں سب نرناری
تُو ہی اُٹھا لے سُندر مُرلی   تو ہی بن جا شام مراری
تو جاگے تو دُنیا جاگے   جاگ اُٹھیں سب پریم پجاری

جاگ اُٹھیں سب پریم پجاری
گائیں تیرے گیت

بسالے

اپنے من میں پریت

نفرت اِک آزار ہے پیارے — دکھ کا دارو پیار ہے پیارے

آجا اصلی روپ میں آجا — تو ہی پریم اوتار ہے پیارے

یہ ہارا تو سب کچھ ہارا — من کے ہارے ہار ہے پیارے

من کے ہارے ہار ہے پیارے

من کے جیتے جیت

بسالے

اپنے من میں پریت

دیکھ بڑوں کی ریت نہ جائے — سر جائے پر میت نہ جائے

میں ڈرتا ہوں کوئی تیری — جیتی بازی جیت نہ جائے

جو کرنا ہے جلدی کر لے — تھوڑا وقت ہے بیت نہ جائے

تھوڑا وقت ہے بیت نہ جائے

وقت نہ جائے بیت

بسالے اپنے من میں پریت

مستوں پہ انگلیاں نہ اٹھاؤ بہار میں — دیکھو تو ہوش بھی ہے کسی ہوشیار میں

کچھ محتسب کا خوف ہے کچھ شیخ کا لحاظ — پیتا ہوں چھپ کے دامنِ ابرِ بہار میں

وہ سامنے دھری ہے صراحی بھری ہوئی — دونوں جہاں ہیں آج مرے اختیار میں

جھوٹی تسلیوں سے نہ بہلاؤ جاؤ جاؤ — جاؤ کہ تم نہیں ہو مرے اختیار میں

وہ عندلیبِ گلشنِ معنیٰ ہوں میں حفیظ
سوزِ سخن سے آگ لگا دوں بہار میں

رنگ بدلا یار کا وہ پیار کی باتیں گئیں — وہ ملاقاتیں گئیں وہ چاندنی راتیں گئیں

پی تو لیتا ہوں مگر پینے کی وہ باتیں گئیں — وہ جوانی وہ سیہ مستی وہ برساتیں گئیں

اللہ اللہ کہہ کے بس اک آہ کرنا رہ گیا — وہ نمازیں وہ دعائیں وہ مناجاتیں گئیں

حضرتِ دل ہر نئی الفت سمجھ کر سوچ کر — اگلی باتوں پر نہ بھولیں آپ وہ باتیں گئیں

راہ و رسمِ دوستی قائم تو ہے لیکن حفیظ
ابتدائے شوق کی لمبی ملاقاتیں گئیں

بے تعلق زندگی اچھی نہیں — زندگی کیا موت بھی اچھی نہیں

دل لگاؤ تو لگاؤ دل سے دل — دل لگی ہی دل لگی اچھی نہیں

ہوش میں آ او دلِ خانہ خراب — دل بروں سے دل لگی اچھی نہیں

یہ ہوا یہ ابر یہ سبزہ حفیظ
آج پینے میں کمی اچھی نہیں

حُسن نے سیکھیں غریب آزاریاں — عِشق کی مجبوریاں لاچاریاں

بہ گیا دل حسرتوں کے خون میں — لے گئیں بیمار کو بیماریاں

سوچکر غم دیجئے، ایسا نہ ہو — آپ کو کرنی پڑیں غمخواریاں

دار کے قدموں میں بھی پہنچی نہ عقل — عِشق کے ہی سر رہیں سرداریاں

اِک طرف جنس وفا قیمت طلب — اک طرف میں اور مری ناداریاں

ہوتے ہوتے جان دوبھر ہوگئی — بڑھتے بڑھتے بڑھ گئیں بیزاریاں

تم نے دنیا ہی بدل ڈالی مری
اب تو رہنے دو یہ دنیا داریاں

وفاداریاں سخت نادانیاں ہیں — کہ اِنکے نتیجے پشیمانیاں ہیں

پشیمانیاں ہیں گناہوں پہ لیکن — بڑے ہی مزے کی پشیمانیاں ہیں

مری زندگی پر تعجب نہیں تھا — مری موت پر اُنکو حیرانیاں ہیں

محبت کرو اور نباہو تو پوچھوں — یہ دشواریاں ہیں کہ آسانیاں ہیں

ندامت ہوئی حشر میں جنکے بدلے — جوانی کی دوچار نادانیاں ہیں

اس شوخ نے نگاہ نہ کی۔ ہم بھی چپ رہے
ہم نے بھی آہ آہ نہ کی۔ ہم بھی چپ رہے

آیا نہ اُن کو عہدِ ملاقات کا لحاظ
ہم نے بھی کوئی چاہ نہ کی ہم بھی چپ رہے

دیکھا کئے ہماری طرف بزمِ غیر میں
تجدید رسم و راہ نہ کی۔ ہم بھی چپ رہے

تھا زندگی سے بڑھکے ہمیں وضع کا خیال
جب عمر نے نباہ نہ کی۔ ہم بھی چپ رہے

خاموش ہو گئیں جو امنگیں شباب کی
پھر جرأتِ گناہ نہ کی۔ ہم بھی چپ رہے

مغرور تھا کمالِ سخن پر بہت حفیظؔ
ہم نے بھی واہ واہ نہ کی۔ ہم بھی چپ رہے

تبسم

سنہ ۱۸۹۹ء

صوفی غلام مصطفےٰ صاحب تبسّم کا وطن امرت سر ہے۔ آپ ۴ر اگست ۱۸۹۹ء
میں پیدا ہوئے۔ بی۔اے۔ بی۔ٹی کرنے کے بعد آپ گورنمنٹ سکول میں ملازم
ہو گئے۔ پھر ایم۔اے (فارسی) کا امتحان پاس کرنے کے بعد سنٹرل ٹریننگ کالج
میں السنۂ شرقیہ کے پروفیسر ہو گئے۔ ٹریننگ کالج سے او۔ٹی کی جماعتیں ختم
ہونے پر آپ تبدیل ہو کر گورنمنٹ کالج، لاہور میں چلے آئے۔ جہاں اس وقت
سے فارسی کی تدریس میں مشغول ہیں۔

تبسّم بیشتر فارسی میں لکھتے ہیں۔ آپ کی کئی غزلیں اور نظمیں نگار اور ملک کے
دوسرے بلند پایہ ادبی رسائل میں طبع ہو کر بہت مقبول ہوتی ہیں، لیکن اردو میں
بھی آپ گاہے گاہے لکھتے ہیں، اور اسی سلاست اور روانی کے ساتھ جو آپ
کے فارسی کلام کا طرۂ امتیاز ہے۔ کلام جو طبع ہو چکا ہے۔ وہ منتشر طور پر محفوظ

ہے۔ اور جو شائع نہیں ہوا۔ اُس کا کچھ پتہ نہیں۔

نہایت ملنسار اور خلیق دوست ہیں۔ مخزن جب ابوالاثر حفیظ جالندھری کی ادارت میں شائع ہونا شروع ہوا تو اُس میں آپ نے بہت دلچسپی لی اور ادارتی فرائض میں حصہ لینے کے علاوہ آپ نے اپنے بلند پایہ مضامین نظم و نثر سے اس کے ادبی محاسن میں اضافہ کیا۔

انتخابِ کلام

حمد

کیونکر نہ زباں پر ہو تحمید و ثنا تیری
دل محو نوا تیرا جاں مدح سرا تیری

آوازۂ انا الحق سے غافل ہوں تو کیونکر ہوں
ہر ایک سرِ مو سے آتی ہے صدا تیری

پھولوں کی مہک میں تو انجم کی جھلک میں تو
وہ رنگِ وفا تیرا یہ شانِ ادا تیری

کہسار و بیاباں میں گلشن میں خیاباں میں
خوشبو لئے پھرتی ہے ہر صبح صبا تیری

ظالم کی جفاؤں میں مظلوم کی آہوں میں
اندازِ جفا تیرا تصویرِ غنا تیری

ہر پردے میں چھپنے کے انداز نرالے ہیں   ہر ذرے کے دامن میں رقصاں ہے ضیا تیری
اس شانِ تغافل سے گمراہ ہزاروں ہیں   جس شانِ تغافل کو کہتے ہیں ادا تیری

ہم سے بھی گنہگاروں کو تیرا سہارا ہے
چھوڑے تو کرم تیرا پکڑے تو رضا تیری

کچھ راز نہیں کھلتا باطن میں نہاں کیا ہے   یہ فقر و غنا کیا ہے یہ سود و زیاں کیا ہے
ظالم کی ستم کیشی مظلوم کی دل ریشی   یہ شور و شغب کیا ہے یہ آہ و فغاں کیا ہے
واں حسن سنورتا ہے یاں عشق مچلتا ہے   وہ ناز و ادا کیا ہے یہ سوزِ نہاں کیا ہے
اس چرخ کے محمل میں اس ارض کی محفل میں   پنہاں ہے جو کچھ کیوں ہے جو کچھ ہے عیاں کیا ہے
ہے سینۂ انساں میں کیا قلب کی کیفیت   اور قالبِ خاکی میں یہ روح رواں کیا ہے
ہے آنکھ کے پردے میں بینش کی حقیقت کیا   انسان کے منہ میں جو رکھی ہے زباں کیا ہے
توصیف میں تیرے جو ہے نغمہ سرا شاعر   یہ ذوقِ سخن کیسا یہ زورِ بیاں کیا ہے

اے خوگرِ تنہائی اے برقِ شناسائی
ایں پردہ چہ آویزی ویں بزم چہ آرائی

بارگاہِ حُسن میں

جہاں میں خلدِ مسرت کی یادگار ہے تُو
مرا فسانۂ غم سن کے سوگوار نہ ہو
تو نو عروسِ شبستانِ زندگانی ہے
تو نو بہارِ گلستانِ شادمانی ہے
شباب کھیل رہا ہے ترا بہاروں میں
نشاطِ حُسن کے شاداب خندہ زاروں میں
سرور و خواب کی دُنیائے کیف بار ہے تُو
مرا فسانۂ غم سُن کے بے قرار نہ ہو
تری نگاہ میں فردوس رقص کرتے ہیں
لبوں پہ جنتیں عشرت کی مُسکراتی ہیں
تری اداؤں پہ لرزاں ہیں کوثر و تسنیم
ضیائیں حور و ملائک کی جگمگاتی ہیں
ترا شباب طرب زارِ حُسن فطرت ہے

جہاں میں تُو ابدی راحتوں کی جنت ہے
مرا فسانۂ غم سن کے اشکبار نہ ہو

سکونِ قلب کو تکلیف اضطراب نہ دے
خدا کے واسطے تیغِ نگہ کو آب نہ دے

تم آسماں کی طرف نہ دیکھو

یہ چاند، یہ کہکشاں، یہ تارے یونہی چمکتے رہیں گے سارے
یونہی ضیا بار ہوں گے دائم یہی رہے گا نظام قائم
تم آسماں کو ہو دیکھتے کیا
کرو نظارہ دلِ حزیں کا
غمِ محبت کے داغ دیکھو یہ ٹمٹماتے چراغ دیکھو
ہے چند روزہ نمود ان کی نہیں ہے کچھ اعتبار ہستی
یہ شمع خاموش ہو نہ جائے
یہ بختِ بیدار سو نہ جائے

تم آسماں کی طرف نہ دیکھو

یہ دلکشا، جانفزا ہوائیں یہ اودی اودی سیہ گھٹائیں
یونہی سدا کیف بار ہوں گی ہزار کیا لاکھ بار ہوں گی
ہٹا لو آنکھ اپنی چرخ پر سے
نظر ملاؤ مری نظر سے

اِن آنسوؤں کی بہار دیکھو رواں ہے یہ آبشار دیکھو
ہے چند دن اسکی یہ روانی رہیگی کب تک یہ زندگانی
یہ قلب خوں ہو کے بہ نہ جائے
یہ چشمہ بہ بہ کے رہ نہ جائے
تم آسماں کی طرف نہ دیکھو

بہت مضطر بہت دردآشنا دل عجب آفت کا ٹکڑا ہے مرا دل
وفا کیا اور وفا کا تذکرہ کیا تمہارے سامنے جب رکھدیا دل
یہ دل میں تو نے پیکاں رکھدیا ہے کہ دل میں رکھدیا اک دوسرا دل
ہم اپنے دل کی حالت سن کے روئے ہمارا حال سنکر رو دیا دل

یہ بجلی ہے کہ شعلہ ہے کہ سیماب — مرے آغوش میں ہے کیا بلا دل
ہر اک سے ہے وفا کی تم کو امید — ہر اک دل کو سمجھتے ہو مرا دل ؟
اسے جنبش نہیں ہوتی فغاں سے — خدا نے کیا بنایا ہے ترا دل

تبسم ہے عجب واژونیِ بخت
میں ہنستا ہوں تو روتا ہے مرا دل

ہوتا تھا اثر کبھی فغاں کا — منہ دیکھ رہا ہوں آسماں کا
اے شوق نہ چھیڑ یہ فسانہ — رنگ اُڑنے لگا ہے رازداں کا
یہ غنچۂ نو شگفتہ کیا ہے — ٹوٹا ہوا دل کسی جواں کا
میں اور جگر گدازیِ ضبط — تو اور اثر تری زباں کا
بلبل کی ترانہ ریزیوں میں — انداز ہے میری داستاں کا
اندوہ شب فراق مت پوچھ — کیا حال تھا جان ناتواں کا
آنکھوں میں تھی شام غم کی صورت — تھا سامنا مرگِ ناگہاں کا

دل میں میرے جو ترا ذوق تمنا ہوگا — مجھ کو مدفن مرا آغوشِ مسیحا ہوگا
مضطرب ہو کے جو اُٹھتا ہے ترے در کا غبار — کوئی بیتاب تہِ خاک تڑپتا ہوگا

تونے کھائی تو قسم ضبط محبت کی مگر — وہ کہیں بزم میں آجائیں تو پھر کیا ہوگا

اپنے بیمار کے بالیں پہ وہ خاموش ہیں یوں — نزع میں آہ نہ کرنے کا اشارا ہوگا

دیکھ اے جذبۂ بیتاب سنبھل کر رہنا — آج سنتے ہیں وہ پھر انجمن آرا ہوگا

حسن گلزار ہے تحسینِ نگہ کا محتاج — آپ جس پھول کو توڑیں وہی رعنا ہوگا

وحشت آموز تمنا ہے تری خوئے حجاب — حسن رسوا نہ سہی عشق تو رسوا ہوگا

ہم سمجھتے تھے تبسم بھی کوئی صوفی ہے
کیا خبر تھی کہ وہ مے نوش بلا کا ہوگا

دل کو جب بے کلی نہیں ہوتی — زندگی، زندگی نہیں ہوتی

جان پر کھیلتے ہیں اہلِ وفا — عاشقی دل لگی نہیں ہوتی

کیا کروگے کسی کی دلداری — تم سے تو دلبری نہیں ہوتی

موت کی دھمکیاں نہ دو مجھ کو — موت کیا زندگی نہیں ہوتی؟

غور سے دیکھتا ہوں جب تجھ کو — میری ہستی مری نہیں ہوتی

عشق میں ہوشیاریاں بھی ہیں — محض وارفتگی نہیں ہوتی

توبہ کرتے ہیں اس لئے زاہد — ہم نے اسوقت پی نہیں ہوتی

عشق کی اشک ریزیوں کے بغیر — آبروِ حسن کی نہیں ہوتی

اس کو میں بزم کس طرح کہدوں — جس میں صورت تری نہیں ہوتی
دل تبسم کسی کو دو پہلے
مفت میں شاعری نہیں ہوتی

رباعیات

محرومیٔ آرزو کا شکوا کرنا — ہے رنج میں اور رنج پیدا کرنا
جب بحرِ الم میں ڈوبتا ہو انساں — اللہ پہ چاہیے بھروسا کرنا

ہر رنج کہن کو بھول جانا سیکھو — ہر تازہ خوشی سے لَو لگانا سیکھو
جب درد سے چاک چاک ہو جاتے دل — مانند کلی کے مسکرانا سیکھو

دیکھو شبِ ہجر کی درازی دیکھو — آشوبِ الم کی جانگدازی دیکھو
دیکھو تو ذرا نیازمندی میری — اور اِس پہ تم اپنی بے نیازی دیکھو

اربابِ وفا کی جاں گدازی دیکھی
اور اس پہ ستم کی سرفرازی دیکھی
مفلس کا نیاز ہو کہ منعم کا غرور
ہر چیز میں تیری بے نیازی دیکھی

ہے روحِ حیات زندگانی تیری
ہے جانِ نشاط شادمانی تیری
جلووں سے ترے ہے ذرہ ذرہ رقصاں
فطرت کا شباب ہے جوانی تیری

آساں نہیں حالِ دل عیاں ہو جانا
خاموشی سے تم نہ بدگماں ہو جانا
خودداریٔ عشق نے سکھایا مجھ کو
دل دیکھ کے کسی کو بے زباں ہو جانا

آنکھوں میں خمارِ شوق افزا لیکر
جذبات کی اِک خموش دُنیا لیکر
آجائے کوئی، پیوں، پلاؤں، جھوموں
بیٹھا ہوں سبو و جام و صہبا لیکر

آغوش میں آ کہ کامرانی کر لوں
کچھ روز خوشی سے زندگانی کر لوں
اِک جام مئے طرب پلا دے ساقی
فانی ہے حیات، جاودانی کر لوں

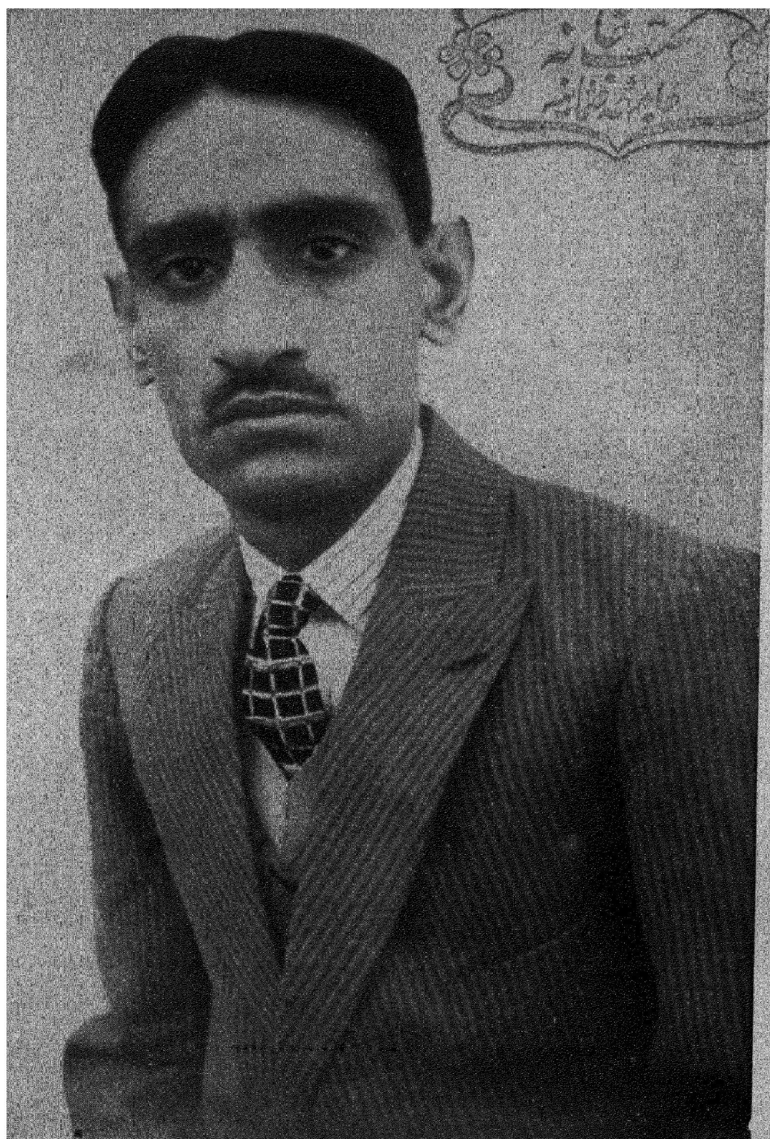
حجروں سے نکل کر کبھی آتے نہیں باہر — اسلام پہ مر مٹنے کے ارمان بہت ہیں
اللہ رکھے مفتیٔ دوراں کو سلامت — وہ ہیں تو ابھی کفر کے سامان بہت ہیں

دُنیا میں تو کسی سے نہ ڈر مولوی سے ڈر — عقبےٰ کا بھی خیال نہ کر مولوی سے ڈر
دل تیرا حق شناس نہیں ہے اگر نہ ہو — ڈرتا نہیں خدا سے نہ ڈر مولوی سے ڈر
کعبے سے آرہی ہے صدا لا الٰہ کی — ہے مسجدوں میں شور مگر مولوی سے ڈر
ان رہنمائیوں میں ہے گمراہیوں کا رنگ — اس چودھویں صدی کے خضر مولوی سے ڈر
گر ترک پنجگانہ کیا تو نے فکر کیا — دیوانہ وار شام و سحر مولوی سے ڈر

سینے میں تیرے پرتوِ ایماں نہیں نہ ہو
رکھ وضع ظاہری پہ نظر مولوی سے ڈر

منہ شرع سے اسلام سے موڑا ہم نے — اللہ کا ہر ایک حکم توڑا ہم نے
وہ گھر کہ بتوں سے ہو گیا تھا خالی — پھر دیر اُسے بنا کے چھوڑا ہم نے

قبروں کو سمجھ لیا ہے ہم نے معبود — قبروں کو بنا لیا ہے ہم نے مسجود
ایمان کی شان ہے ہمارے نزدیک — توحید کے حامیوں کو کہنا مردود



ندیم

(سنہ ۱۸۹۹ء ــــــــــ)

منصور احمد صاحب مولوی محمد حسین صاحب صادق کے صاحبزادے ہیں۔آپ کی پیدائش ، راگست سنہ ۱۸۹۹ء کو جموں میں ہوئی۔ زندگی کے ابتدائی ایام جموں میں ہی بسر کئے۔ لیکن سنہ ۱۹۱۱ء میں آپ کا سارا خاندان مستقل طور پر لاہور میں منتقل ہوگیا۔ اس لئے اُس وقت سے وہیں مقیم ہیں۔

آپ نے عربی فارسی ۔ اردو اور انگریزی کی درسی کتب کا گھر پر ہی مطالعہ کیا۔ خاندان میں علمی چرچا ہونے کی بدولت اردو فارسی اور عربی کی تحصیل تو تقیناً دشوار نہ تھی۔ لیکن تعجب انگیز امر یہ ہے۔ کہ آپ نے خداداد ذہانت اور ذاتی سعی سے انگریزی علم وادب کی تحصیل اس وسیع طور پر کی ہے کہ مغرب کے بیشتر اُدبا۔ کی مشہور تصانیف کا مطالعہ آپ کر چکے ہیں۔

ادبی سرگرمیوں کے سلسلہ میں جہاں ملک کے مستند جرائد میں آپکے

مضامین شائع ہوتے رہے ہیں۔ وہاں آپ ۱۹۲۷ء سے لیکر متواتر چار سال تک "ہمایوں" کے فرائض ادارت بھی ادا کرتے رہے ہیں۔ جن اصحاب نے اِس عرصہ میں "ہمایوں" کا مطالعہ کیا ہے۔ انہیں معلوم ہوگا۔ کہ اُس وقت 'ہمایوں' میں اُس کی گذشتہ روایات کے مطابق کتنے بلند پایہ مضامین نظم و نثر کا اندراج ہوتا تھا۔ جو یقیناً منصور صاحب کے حُسنِ ذوق اور صحتِ مذاق پر دال تھا۔ ۱۹۳۱ء میں اپنی طویل علالت کی وجہ سے 'ہمایوں' سے علیحدہ ہونے پر مجبور ہو گئے ۱۹۳۲ء میں جب حضرتِ تاجور نجیب آبادی 'ادبی دنیا' کے حقوقِ ملکیت سے دستبردار ہوئے۔ تو کارکنانِ اہتمام نے 'ادبی دنیا' کی زمام ادارت منصور صاحب کے سپرد کر دی۔ چنانچہ اب تک آپ یہی خدمت انجام دے رہے ہیں۔

منصور صاحب کے اکثر مضامین نثر 'ہمایوں' اور 'ادبی دنیا' میں شائع ہو کر ملک سے خراجِ تحسین وصول کر چکے ہیں لیکن بہت کم لوگوں کو علم ہوگا۔ کہ آپ شعر بھی کہتے ہیں۔ حُسنِ اتفاق سے مجھے اس کا پتہ چلا۔ تو آپ نے میرے اصرار پر بتایا کہ 'ہمایوں' اور 'ادبی دنیا' میں ندیم کا فرضی نام آپ ہی کی پردہ داری کیا کرتا ہے۔

یہ کہنا غلط نہ ہوگا۔ کہ ندیم کے بیشتر اشعار منصور کی ہر اُس ظاہری

کیفیت کے آئینہ دار ہیں جس سے وہ پہلی ملاقات میں چشم ناظر کو متاثر کرتے ہیں۔
آپ اُن سے ملیں۔ نوکرسی ادارت پر مغربی بباس سے مزّین ایک ایسا اِنسان
بیٹھا ہوا نظر آئے گا۔ جس کا ہر انداز مشرقی متانت و سنجیدگی میں ملفوف ہوگا۔
سیاسی۔ ادبی۔ علمی یا سماجی مسائل پر بحث کیجیئے۔ کیا مجال جو تحمل و متانت کا دامن
اُنکے ہاتھ سے چھوٹے۔ یہاں تک کہ جمالیات بلکہ اوسکر وائلڈ اور قلوپطرہ کی
زندگی کے متداول رُخ کی تفاصیل بھی اسی انداز میں بیان کرتے چلے جاتے ہیں
اور آپ مایوس ہوکر یہ کہنے پر مجبور ہوجاتے ہیں۔ کہ شاید ان کے دل نہیں ہے لیکن
یہی بے حس اِنسان جو محبت کرنے کی دعوت[1] کو بھی قبول نہیں کرتا۔ گاہے گاہے
اپنی ذہنی کیفیات کو "اوشا" کی صورت میں نظم کرتا ہے۔ یہ نظم آپ کی شوخ نگاری
کا ایک لطیف سا نمونہ ہے۔ اور اسی لئے اسے آپ کی نسبتاً زیادہ متین لیکن پُرکیف

---

[1] ایک دفعہ سید عابد علی صاحب عابدؔ کے سامنے منصور صاحب کی شخصیت پر تبصرہ ہو رہا تھا منصور صاحب بھی تشریف رکھتے تھے۔ عابدؔ صاحب نے اُن سے مخاطب ہوکر فرمایا "میں تو آپ سے کئی دفعہ کہہ چکا ہوں۔ آیئے کسی سے محبت کریں۔ زندگانی کا یہ رُخ بھی قابل مطالعہ ہے اور لاہور میں اِسکے مواقع بھی بہت ہیں" لیکن منصور صاحب اس دعوت کے جواب میں ایک لمحہ کے لئے متبسم ہوئے۔ اور پھر بولے "صاحب ہم سے محبت نہیں ہو سکتی"۔

رباعیات اور غزل کے پہلو بہ پہلو انتخاب میں درج کیا گیا ہے۔

تصنیف

دُنیا کے بہترین افسانے

منصور صاحب کی مستقل تصنیف صرف اُن افسانوں کے مجموعہ کی صورت میں شائع ہوئی ہے۔ جو مغربی افسانہ نگاروں کے شاہکاروں کے کامیاب ترجمے ہیں۔ افسانوں کا یہ مجموعہ جدید و قدیم مغربی مصنفین کے نتائج کاوش کا بہترین انتخاب ہے۔ جو فاضل مترجم نے نہایت خوش اسلوبی سے اردو کے قالب میں ڈھالا ہے۔

انتخابِ کلام

اوشا

اوشا حُسن وادا کی دیوی　　اوشا صبح کے نور کی پُتلی

مجھ سے شرم و حیا کی دیوی　　دُور سمٹ کر جا بیٹھی ہے

اسکے ہاتھ میں مصحفِ دیں ہے　　میری نظر میں مصحفِ رُخ ہے
حُسن اُس کا پیغامِ وفا ہے　　میرا دل جس کا پاسخ ہے

یُوں محسوس مجھے ہوتا ہے　　یہ "جلوت نہیں خلوت ہے یہ
مجھ کو کسی سے کام نہیں ہے　　یہ دُنیا نہیں جنت ہے یہ

عشق کے دیوتا کا مندر ہے　　حاضر ہیں ہم اُس کے آگے
دونو دل اِک بُت کے پجاری　　دونو سر خم اُس کے آگے

وہ دیندار ہے کافر ہوں میں　　لیکن مہر و وفا کا بندہ
وہ اک صدق و صفا کی دیوی　　اور میں صدق و صفا کا بندہ

محبّت کا دِن

(بے قافیہ نظم)

رفعتِ گردوں سے صبح　　ایک سنہری کرن

آئی لرزتی ہوئی کانپتی ڈرتی ہوئی
اور بکھرتی ہوئی لرزش سیماب پر
نہر کی ہر موج کے سینۂ بیتاب پر
جیسے محبت سے چور ایک چھلکتی ہوئی
عشق کے جذبات سے ایک چھلکتی ہوئی
کوئی نگہ ڈال دے چہرۂ محبوب پر
ہوتی ہے یوں ابتدا عشقِ فسوں ساز کی

ہے یہ محبت کی صبح

زینۂ افلاک کو کر گیا طے آفتاب
فطرتِ روشن ہوئی اسکی جوانی بے حجاب
وادی میں اک جوئے سیم کروٹیں لینے لگی
ندی کے پانی میں یا نور کا چشمہ ملا
یا کوئی کیف آفریں خواب تھا جذبات کا
پھیلتا ہے بس یونہی نور محبت کا بھی
عشق کے دن کا عروج عشق کا نصف النہار

آہ مگر آفتاب برلبِ بام آگیا
شام کا سایہ بڑھا اور فلک کی تمام
آن وہ رخصت ہوئی شان وہ رخصت ہوئی
نور کی وہ کیفیت محو سراسر ہوئی
آہ کہ جذبات کی بدلی ہوئی آنکھ سے
کھو گیا سب اعتبار مٹ گیا سب ذوق و شوق
ہوتا ہے یونہی زوال
عشق کے اقلیم میں
یہ ہے محبت کی شام

غزل

مرے جرمِ عشق کی اس قدر۔ مجھے اے ندیم سزا نہ دے
مرے دل پہ اتنی جفا نہ کر۔ مجھے یوں نظر سے گرا نہ دے
یہی ایک گوہرِ بے بہا مری زندگی کا ہے ماحصل

مجھے ڈر ہے تیری یہ بے رُخی غمِ آرزو کو مٹا نہ دے

ہے خموش آتشِ زندگی مگر اک شرر ترے عشق کا

مرے دل میں اب بھی چمک رہا ہے اسے بھی یاس بجھا نہ دے

اب اگرچہ قابلِ اعتبار ہے غیر ہی کی وفا مگر

مری اُس وفا کو جو اعتبار سے گر چکی ہے بھلا نہ دے

جو مجھے یقیں ہو کہ میں ہی تیرے حریمِ غم کا رفیق ہوں

تو بلا سے گر مجھے بزمِ عیش میں بار تیری عطا نہ دے

رُباعیات

اِس قیدِ تذبذب سے چھڑا دے مجھکو ... اِس زیست سے بہتر ہے مٹا دے مجھ کو

اے دوست جو پنہاں ہے ترے سینے میں ... وہ رازِ دلِ افگار بتا دے مجھ کو

ہو اُس کی رسائی نہ اگر محمل تک ... مجنوں کا جنوں ہے رہنما محمل تک

اے کاش اسی طرح سے میں بھی اے کاش ... ناگاہ پہنچ جاؤں تری منزل تک

اے کاش نہ ختم یہ کہانی ہوتی　　برہم نہ یہ بزمِ شادمانی ہوتی
اے کاش سدا قرارِ گل کو ہوتا　　اے کاش بہار جاودانی ہوتی

اے آہ ہوئیں کیا وہ خوشی کی راتیں　　وہ پیار کی لطفِ باہمی کی راتیں
جب سے کہ وہ چاند ہے نظر سے اوجھل　　تاریک ہیں میری زندگی کی راتیں

اب دل میں مرے کوئی سماتا ہی نہیں　　تجھ بن کوئی اور مجھ کو بھاتا ہی نہیں
جلوے تو ہزار ہیں پہ اے جانِ ندیمؔ　　آنکھوں کو مری نظر کچھ آتا ہی نہیں

ڈر ڈر کے جو میرے سر کو ٹھکراتے ہو　　آہستہ دل و جگر کو برماتے ہو
جس جور کی مدتوں تمنا کی ہے　　اے جانِ ندیمؔ اُسی سے شرماتے ہو

کیوں پھر مجھے بار بار یاد آتے ہو　　کیوں پھر مرے دل میں آگ بھڑکاتے ہو
اِک میں ہوں کہ کھو چکا ہوں اپنی ہستی　　اِک تم ہو کہ پھر بھی مجھے پا جاتے ہو

تم نے کبھی زندگی سے نفرت کی ہے ؟
برپا کبھی جان پر قیامت کی ہے ؟
معلوم ہے تم کو وصل کیا ہے کیا ہجر ؟
اے دوست کبھی تم نے محبت کی ہے ؟

حامدؔ

(سنہ ۱۹۰۱ء ـــــــــــ)

مولانا حامد علی خاں صاحب مولانا ظفر علی خاں صاحب کے چھوٹے بھائی ہیں۔ مولد و وطن کرم آباد ہے جہاں آپ ۱۴ جنوری سنہ ۱۹۰۱ء کو پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم وزیر آباد میں ہوئی۔ جہاں سے آپ نے میٹریکولیشن کا امتحان پاس کیا۔ آپ کے کالج کے ایام میں تحریکِ ترکِ موالات زوروں پر تھی۔ کچھ گھر کی فضا سے اور کچھ عام حالات سے متاثر ہو کر آپ تحصیلِ علم کے لئے مسلم نیشنل یونیورسٹی علیگڈھ میں چلے گئے۔ اس عرصے میں آپ سودیشی پسند ہو گئے۔ بلکہ صرف کھدر میں ملبوس رہتے۔ نیشنل یونیورسٹی سے بی۔ اے کی ڈگری حاصل کرنے پر پھر وہیں پروفیسر ہو گئے لیکن یکایک طبیعت اِس جملہ نظام سے اچاٹ ہو گئی۔ اور آپ پنجاب میں واپس چلے آئے۔ جہاں آپ نے پنجاب یونیورسٹی سے منشی فاضل اور بی۔ اے کا امتحان پاس کیا۔ کچھ عرصے کے بعد آپ کو ہمایوں کی ادارت کے فرائض سپرد ہوئے چنانچہ تا دمِ تحریر یہی شغل ہے۔

تنہائی پسند انسان ہیں مخلص ہونے کے باوجود چونکہ نام ونمود سے متنفر ہیں اس لئے عام لوگوں سے انکے روابط کچھ زیادہ نہیں۔ بلکہ جب کبھی کسی ادبی مجلس کی بھی آپ کو کوئی اہم رکنیت تفویض ہوئی ہے۔ تو آپ نے اس کو قبول کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ آپ اردو سبھا لاہور کے معتمد ہیں لیکن جب انجمن اردو پنجاب کی طرف سے بھی آپ کو نائب معتمد ہونے کی دعوت دی گئی۔ تو آپ نے یہ ذمہ داری لینے سے انکار کر دیا۔

شعر کہنے کا ذوق بچپن سے ہے۔ تغزل میں پاکیزگی اور متانت اس قدر ہے کہ صفِ اولین کے شعراء میں سے شاید ہی کسی کے کلام میں موجود ہو۔

تصنیفات

۱۔ **حامد کے سو شعر**۔ آپ کے سو منتخب اشعار کا مجموعہ ہے جس میں آپکی شاعری پر ایک نہائت مبسوط تبصرہ بھی شامل ہے جو مولانا منصور احمد صاحب مدیر ادبی دنیا نے لکھا ہے۔

۲۔ **افسانہائے عشق**۔ چند رومانی افسانوں کے تراجم ہیں زبان اس قدر شستہ ہے کہ افسانے طبعزاد معلوم ہوتے ہیں۔

انتخابِ کلام

ہے علم کیا جنوں ہے حقیقت یہی تو ہے — رہ بے خبر کہ راہِ سلامت یہی تو ہے

دھوکا ہے سب مجاز و حقیقت کا امتیاز — اے بے خبر سُراغِ حقیقت یہی تو ہے

وہ اس سے بے نیاز ہے یہ اُس سے بے خبر — انسان اور خدا کی محبت یہی تو ہے

دنیا نگار خانۂ جنت ہے سر بسر — ذوقِ نظر تجھے نہیں حیرت یہی تو ہے

غافل فریبِ وعدۂ فردا میں مر گئے — یا رب وہ باغِ خلد وہ جنت یہی تو ہے

ہے ذرہ ذرّہ روئے حقیقت پہ غازہ بند — محرم نہیں ہے تو ہی مصیبت یہی تو ہے

پہلو میں اک جہان کو ہم لے کے مٹ گئے — یہ حشرِ دل کا آہ قیامت یہی تو ہے

حامدؔ یہی ہے آپ کی منزل خدا گواہ

حضرت یہی ہے کوئے ملامت یہی تو ہے

مذاقِ زندگی ہر شے کو حسبِ مدعا سمجھا — فنا کے گھونٹ کو بھی جرعۂ آبِ بقا سمجھا

ہر اک آفاق کے نغمے میں ہے اتنی ہم آہنگی — کہیں اِک خاک کے ذرّے کو "شرحِ والسما" سمجھا

میں اے تقدیرِ ہستی ممکناتِ اوجِ فطرت کا — خدا کو مبتدا سمجھا بشر کو منتہا سمجھا

یہ مشتِ خاک سرِ افلاک کا اک دن جھکا دیگی   خدائی خود کہے گی میں نے بندے کو خدا سمجھا

کسی مشکل میں جب پائی نہ ہمت سرنگوں اپنی   تو قلبِ خود نگر شرحِ حدیثِ "ماقلی" سمجھا

یہ دنیا کیا ہے میدانِ وغا ابلیس و یزداں کا   وہی سمجھا اسے جو محشرِ کرب و بلا سمجھا

وہ میرے گوہرِ پاکیزہ کو سمجھا خذف ریزہ
لہو کی بوند کو سرمایۂ برگِ حنا سمجھا

بے روح تھی یہ خاک نہیں جانِ جہاں ہو   تخئیل ہو یا خواب ہو یا وہم و گماں ہو

آسودہ ہو سمٹے ہوئے قطروں کی رگوں میں   پھیلے ہوئے دریا میں کراں تا بہ کراں ہو

ہے ربط تو دونوں میں مگر چشم و نظر کا   تم ہو مری آنکھوں میں مگر مجھ سے نہاں ہو

یارب یہ حجابات سراپردۂ اسرار   اور ایک سراسیمہ بہر سو نگراں ہو

جاری نہ ہوا کشمکشِ ضبط غضب ہے   وہ اشک جو اک عمر سے پلکوں میں نہاں ہو

تکوینِ دو عالم کا سبب ذات تمہاری   سرتاجِ جہاں ہو شرفِ کون و مکاں ہو

ہمراہ ہو تم کاش کبھی ختم نہ ہو راہ   صد حیف اگر طے سفرِ دو جہاں ہو

اِس قالبِ بے مایہ کی تم رُوح ہو لیکن   افسوس کہ جو رُوح ہو بے نام و نشاں ہو

اے طبعِ رواں! نُورِ گُل شب کو سحر کر
اے خونِ جگر! آنکھ میں آ لعل فشاں ہو

ہر اک کہتا ہے مجھ سے تو نے کیا دیکھا؛ مجھے سمجھا!

جہانِ خیرہ اپنا دیدۂ بینا مجھے سمجھا

جو پایا اہرمن نے منزلِ شمرہ دُنا میں

تو یزداں رہ نوردِ جادۂ اسرائی مجھے سمجھا

اگر دریائے بے پایاں نے اک قطرہ مجھے جانا

تو میں خوش ہوں کہ ہر قطرے نے اک دریا مجھے سمجھا

میں ہر دم عیب اپنے دیکھ کر دل میں یہ کہتا ہوں

بنوں کس طرح ویسا دوست نے جیسا مجھے سمجھا

تجھ کو نہیں اب پاسِ وفا جان گئے ہم

بدلی ہوئی آنکھیں تری پہچان گئے ہم

اے ناصح ناداں یہ دمِ چارہ گری ہے

وہ دشمن جاں دوست نہیں مان گئے ہم

غنچے کی طرح لائے تھے جمعیتِ خاطر

پرِ گل کی طرح ہو کے پریشان گئے ہم

گلزار کے سایوں میں وہی حشر بپا ہے
پھولوں سے ابھی تک تری خوشبو نہیں جاتی

میں اور جنوں محرمِ منزل ہیں پرے عقل
جب جاتے ہیں اُس بزم میں ہم تو نہیں جاتی

سو جلوے سے محروم ہے میری نگہِ تنگ
تو سامنے ہر سو ہے، یہ ہر سُو نہیں جاتی

دل مٹ گئے پہ رازِ دل افشا ہوا تو کیا
دیوانہ بعدِ مرگ جو رُسوا ہوا تو کیا
میں بے نوا ہوں صرفِ خجالت کیے ہائے ہائے
ہے ایک دل یہ صرفِ تمنا ہوا تو کیا

تم مونس و غمخوارِ دل و جانِ حزیں ہو
ہوتا ہے فلک مجھ سے اگر برسرِ کیں، ہو
اُس رُخ کے تصور سے فراغت نہیں اک دم

تم دُور ہو آنکھوں سے مگر دل کے قریں ہو
بستے ہو مرے دل میں کم آمیز ہو پھر بھی
رہتے ہو مری آنکھ میں اور پردہ نشیں ہو
دیکھو مجھے کیا جذبِ تصوّر نے بنایا
حیران ہے دنیا کہ یہ میں ہوں کہ تمہیں ہو
اک نسخۂ اکسیر محبّت میں ملا ہے
مٹی ہو ترے قدموں کی اور میری جبیں ہو
جنّت نظر آئے ہر اک منزلِ دشوار
ہمراہ ہو تو اور سفرِ روئے

درد ہوں پیکرِ گیتی کیلئے جان ہوں میں
دلِ ہر ذرہ ہوں ہر سمت پریشاں ہوں میں
ذوقِ پرواز سے اُے کاش رہائی پاؤں
آہ وہ اَوج کہاں جس پہ پر افشاں ہوں میں
ظلمت و نور مجھے حُسن نما ہیں دونوں

کیا مصیبت ہے نہ کافر نہ مسلماں ہوں میں

آہ تاریکیٔ زندانِ نظامِ عالم

ایک روزن کے لئے خستہ و حیراں ہوں میں

کیا بنانا تھا مصوّر کو بنا کیا آخر

اپنی بگڑی ہوئی تصویر پہ خنداں ہوں میں

اپنی صحبت سے کہاں بھاگ کے اب میں جاؤں

آہ اے جوشِ جنوں بارِ دل و جاں ہوں میں

خزاں رخصت ہوئی دیتی، سمٹتی، کانپتی، ڈرتی

چمن سر پر اُٹھاتی ناچتی گاتی بہار آئی

لڑھکتی، لڑکھڑاتی، کھڑکھڑاتی پتیاں بھاگیں

سپاہِ گل قطار اندر قطار اندر قطار آئی

پروانہ کرکے ہمتِ مردانہ جل گیا ‌ ‌ ‌ دِل دیکھ کر یہ جرأتِ پروانہ جل گیا

دیکھا چراغِ خانۂ آذر نے کیا کیا؟ ‌ ‌ ‌ بھڑکی وہ آگ اُس سے کہ بتخانہ جل گیا

جلتا ہے کس لئے دل بے مدعا مرا
وحشت ہے سینہ کوب کہ ویرانہ جل گیا

جلنے میں لخت لخت کو سبقت کا شوق تھا
اس دل کا ذرہ ذرہ حریفانہ جل گیا

اے برقِ حُسن اب بھی وہی بے قراریاں ؟
بس اب وُہ دل وہ عشق کا کاشانہ جل گیا

ممکن نہیں کہ بھول سکوں یہ حکایتیں
دفتر ہی گر مرے غمِ دِل کا نہ جل گیا

ہر لختِ دل میں آتشِ غم ہے شرارہ بار
ہو کر ورق ورق مرا افسانہ جل گیا

آخر کھلا کہ سوز سے نا آشنا تھی شمع
اپنے ہی دل کی آگ سے پروانہ جل گیا

یتیم بچّی

مجھ سے محبت کرنے والا
اُلفت کا دم بھرنے والا
کوئی نہیں اس دُنیا میں
اس دنیا میں کوئی نہیں ہے
پیار سے کون بلائے مجھ کو
گود میں کون بٹھائے مجھ کو

میرے ناز اٹھانے والا اس دنیا میں کوئی نہیں ہے

اچھی کہانی مجھ کو سنا کر

پیار سے اپنے پاس بلا کر

چہرہ پہ نظریں گاڑنے والا اس دنیا میں کوئی نہیں ہے

جاگ اٹھوں نہ سلائے کوئی

سوتی رہوں نہ جگائے کوئی

جس کو ہو میری بھی پروا اِس دنیا میں کوئی نہیں ہے

ٹھوکر کھا کر جو گِر جاؤں

آپ ہی بن روتے اٹھوں میں

اس دنیا میں کوئی نہیں ہے اِس دنیا میں کوئی نہیں ہے

سوتے سوتے اگر ڈر جاؤں

پھر بھی تم کو پاس نہ پاؤں؟

اماں! اماں! پیاری اماں اس دنیا میں کوئی نہیں ہے



اثؔر صہبائی

(سنہ ۱۹۰۱ء ———)

خواجہ عبدالسمیع صاحب اثؔر صہبائی ۲۸ دسمبر سنہ ۱۹۰۱ء کو سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ آپ کشمیری فرقہ پال کے معزز رکن ہیں۔ آپ کے والد مولانا احمد دین صاحب پال علوم قدیمہ سے بہرہ یاب اور کئی مذہبی رسائل کے مصنف ہیں۔ ان کے دیگر متعلقین میں بھی کئی عالم اور اہل فکر بزرگ ہیں۔ بڑے بھائی امینؔ حزیں بلند پایہ شاعر ہیں انہیں کی بدولت اثؔر کو شعر کی طرف رغبت ہوئی۔

اثؔر کی ابتدائی تعلیم سیالکوٹ میں ہوئی۔ اسلامیہ کالج، لاہور سے بی۔ اے (آنرز) پاس کیا اور ایل ایل۔ بی کے بعد سیالکوٹ میں وکالت شروع کی۔ اس شغل سے کچھ زیادہ مطمئن نہ تھے۔ پھر لاہور آئے اور گورنمنٹ کالج سے ایم۔ اے (فلسفہ) پاس کیا۔ لیکن پھر وکالت ہی اختیار کرنی پڑی۔ سنہ ۱۹۲۷ء میں آپ نے شادی کی۔ لیکن یہ افسانۂ خوشگوار طویل ثابت نہ ہوا، اور آپ کی رفیقۂ حیات

۱۹۳۱ء میں آپ کو داغِ مفارقت دے گئیں۔ مرحومہ کے فراق میں اثر نے جو نظمیں لکھی ہیں وہ خاص کیفیت کی حامل ہیں۔ سیالکوٹ میں کافی عرصے تک وکالت کرنے کے بعد آپ سرینگر چلے گئے۔ چنانچہ اب وہیں وکالت کرتے ہیں۔ اور معزز وکلا میں شمار ہوتے ہیں۔

بیوی کی موت نے اثر کو مستقل طور پر سوگوار بنا دیا ہے۔ عصرِ حاضر کے فلسفی شعرا میں اثر پہلے بھی صفِ اول میں جگہ پانے کا مستحق تھا، لیکن اس حسرتناک سانحہ نے اس کے سوز میں اور بھی اضافہ کر دیا ہے۔ رباعی اثر کی شاعری کی کامیاب ترین صنف ہے لیکن نظم اور غزل میں بھی اُس کا مذاق خالصاً ادبی اور شاعرانہ ہے۔ اپنی شاعری کے متعلق 'خمستان' میں لکھا ہے:

"رباعیات کے متعلق میں اس سے پیشتر لکھ چکا ہوں کہ ان میں حضرت عمر خیامؒ نیشاپوری کا رنگ نمایاں ہے۔ میری غزل کے ارتقا میں حضرت حافظ شیرازی کی شاعری کو سب سے زیادہ دخل ہے۔ میری ناچیز رائے میں حافظ مغفور کی شاعری میں تغزل نے معراجِ کمال کو پا لیا ہے اور اس لحاظ سے اگر حافظؔ کو دنیا کا بہترین غزل گو شاعر قرار دیا جائے تو بجا ہے۔ اس کے بعد علامہ اقبال مدظلہ العالی کے روح پرور اور حیات افروز نغموں کے اثرات کا معترف ہوں۔ مرزا غالب کی ژرف

نگاہی اور مولانا حسرت موہانی کی شگفتگی بھی میری غزل پر اثر انداز رہی ہے اردو شاعری میں نظم کی حیثیت غزل کے مقابلہ میں چونکہ محض ثانوی رہی ہے۔ اس لئے نظم کا معیار تلاش کرنے کے لئے ہمیں انگریزی شاعری کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے۔ چنانچہ میں نے بھی ایسا ہی کیا ہے۔"

تصنیفات

۱۔ جام صہبائی ۔ اثر کی ابتدائی رباعیات کا ایک مختصر سا مجموعہ ہے جو ۱۹۲۶ء میں شائع ہوا تھا۔

۲۔ خمستان ۔ اثر کے اس سارے کلام کا مجموعہ ہے جو ۱۹۳۳ء تک آپ نے کہا ہے۔

انتخاب کلام

اب کیا کریں جو دل نہ لگائیں خزاں سے ہم
رنگینیاں بہار کی لائیں کہاں سے ہم

برسوں ہؤا نہ فیصلہ فتح و شکست کا
برسوں ستیزہ کار رہے آسماں سے ہم
اے وائے فکرِ راحت و صد وائے خوفِ دام
دیکھا کئے بہارِ چمن، آشیاں سے ہم
وہ جانِ زندگی تو رہا ہم سے سرگراں
اور اپنی زندگی سے رہے سرگراں سے ہم

لبوں پر ہے تبسم آ رہے ہیں
وہ گلہائے ارم برسا رہے ہیں
فضائیں عاشقی کی جھومتی ہیں
وہ زلفِ عنبریں لہرا رہے ہیں
وہ متوالی نگاہوں کا تبسم!
فضائے دل پہ نشّے چھا رہے ہیں
کہاں کعبہ! کہاں خمخانۂ عشق!
یہ صہبائی کو کیوں بہکا رہے ہیں؟

اب خواب ہے آہ دورِ جوانی،
شامِ طرب کی رنگیں کہانی،
ہر نقش میں جلوۂ دلربائی،
ہر ساز میں نغمۂ شادمانی،
وہ چاندنی رات کی بزم رنگیں،
گلفام ساقی، مے ارغوانی،

وہ نازنینوں کا رقصِ مستی،
مطرب کا وہ نغمۂ جاودانی،

وہ دیدۂ شوق کی میگساری،
وہ جلوۂ حسن کی مے فشانی،

وہ وصل کی عشرتِ بادہ نوشی،
وہ ہجر کی لذتِ خونچکانی!!

وہ حسن اور عشق کی داستانیں
کچھ گلفشانی، کچھ خونفشانی،

پرکیف و رنگیں تھی بزمِ ہستی
تھا رشکِ فردوس عہدِ جوانی،

ہر چند وہ محفلیں مٹ چکی ہیں
یاد ان کی لیکن ہے غیر فانی،

عالمِ افسردگی

(۱)

پھیکی پھیکی ہیں چاندنی راتیں!
اب کہاں وہ شباب کی باتیں

بادۂ حسن سے، سحر محروم!
میگساری سے ہے نظر محروم

اب وہ رنگینیاں چمن میں نہیں
نزہتیں لالہ و سمن میں نہیں

شام نا آشنائے مدہوشی،
آہ! وہ دورِ خود فراموشی،

کیفِ دل میں، نظر میں نور نہیں — پی رہا ہوں، مگر سرور نہیں،
رُوح میں لرزشِ حیات نہیں — اب تو مے میں بھی کوئی بات نہیں،

لطف باقی رہا نہ جینے میں!
دل ہی بے حس پڑا ہے سینے میں

(۲)

اب نہ وہ دن ہیں اور نہ وہ راتیں — سب جوانی کی تھیں کراماتیں
اب وہ بیتابیٔ شباب کہاں! — آتشِ شوق بے حساب کہاں!
حُسن ہی حُسن جلوہ فرما تھا — عشق ہی عشق نغمہ پیرا تھا
مری ہر سانس اک فسانۂ حُسن — بزمِ ہستی نگار خانۂ حُسن
جلوۂ حُسن غیر فانی سا — نغمۂ عشق جاودانی سا
شادمانی ہی شادمانی تھی — کیا حقیقت نما کہانی تھی
دل کہ تھا حشر گاہِ جوش و خروش — شعلۂ صد ہزار در آغوش
آخر کار چاک چاک ہوا — بُجھ گیا، بُجھ کے خاک ہوا
بیقراری نہ آہ و زاری ہے — ایک افسردگی سی طاری ہے
کھویا کھویا سا پھر رہا ہوں میں، — گویا صحرا میں لُٹ گیا ہوں میں،

رُباعیات

ظاہر کی نظر نے تجھے پنہاں پایا
باطن کی نظر نے تجھے عُریاں پایا
تھی عقل بھی جویا ترے جلوے کی مگر
کمبخت کو سرگشتہ وحیراں پایا

وہ ابرِ طلسم کار جھُوما!
وہ مونسِ میگسار جھُوما
برسے گی شراب آسماں سے
وُہ میکدۂ بہار جھُوما

لذت کشِ جامِ شادمانی ہوجا!
بیگانۂ رسمِ نوحہ خوانی ہوجا!
سرمستیٔ عشق جاودانی ہے اثرؔ
پی کر مئے عشق جاودانی ہوجا

ہے جام بدستِ ساقیٔ حورسرشت
اب شوقِ حرم کہاں! کہاں شوقِ کنشت
پیتا ہوں بہانگ کوس پیتا ہوں اثرؔ
پروائے جہنم ہے، نہ پروائے بہشت

معمورِ نشاط بھی ہے میخانۂ زیست
آلودۂ زہر بھی ہے پیمانۂ زیست

تاریکیٔ شامِ غم بھی بڑھتی ہی گئی ! رنگین بھی بہت رہا یہ افسانۂ زیست

اے غرقِ گناہ !! اے پشیمانِ حیات ہے یاس سے چاک چاک دامانِ حیات
جی کھول کے بختِ بد پہ رو لے، رو لے ہے گریۂ معصیت میں سامانِ حیات

مسجد میں رہینِ سبحہ خوانی کب تک اندیشۂ رزمِ زندگانی کب تک
زندہ ہے تو کارزارِ ہستی میں نکل یہ فکرِ شکست و کامرانی کب تک

تقدیر سے درسِ خامشی لیتا ہوں ہو جاتا ہوں چپ، لبوں کو سی لیتا ہوں
زہرِ غمِ زندگی ہو یا جامِ نشاط ! جو کچھ بھی ملے خوشی سے پی لیتا ہوں

ہے بزمِ حیات کی نہ پروا مجھ کو ہے ظلمتِ موت کا نہ کھٹکا مجھ کو
ہر شام ہے خوابِ مرگ طاری مجھ پر ہر صبح ہے اِک حیاتِ تازہ مجھ کو

دامانِ سحر کی گلفشانی فانی شبہائے بلائے آسمانی فانی

یہ لمحۂ عشرت ہے غنیمت ساقی بھر جام کہ زندگی ہے فانی فانی!

راحتکدہ

ہوئے خاموش آغازِ محبت کے حسیں نغمے
کہاں ہیں اب شبابِ عاشقی کے آتشیں نغمے
بس اک ٹوٹا ہوا دل یادگارِ عشق باقی ہے
کچھ آنسو ہیں، کچھ آہیں اور کچھ اندوہگیں نغمے

کیا کہوں "راحت" تمہارے غم میں کیا ہوتا رہا
عمر بھر روتا رہا، رو رو کے جاں کھوتا رہا
زندگانی کی شبِ تاریک میں مانندِ شمع،
صبح تک جلتا رہا، گھلتا رہا، روتا رہا!

تاثیر

(سنہ ۱۹۰۲ء ——————)

محمد دین صاحب تاثیر ۲۸ر فروری سنہ ۱۹۰۲ء کو لاہور میں پیدا ہوئے۔ ایم۔ اے تک لاہور میں ہی تعلیم پائی۔ کچھ عرصہ تک سکرٹریٹ میں ملازم رہے۔ اور پھر اسلامیہ کالج' لاہور میں انگریزی زبان اور ادب کی تدریس پر مامور ہوئے سنہ ۱۹۳۴ء کے اواخر میں انگلستان چلے گئے۔ جہاں سے آپ سنہ ۱۹۳۶ء میں کیمبرج یونیورسٹی سے انگریزی کی پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری لے کر آئے۔ اور ایم۔ اے۔ او کالج' امرت سر میں پرنسپل ہو گئے۔

تاثیر ایک عرصہ تک غزل لکھتے رہے لیکن نظم کی طرف رجحان زیادہ تھا اس لئے کچھ عرصہ سے بیشتر نظم ہی لکھتے ہیں۔ علامہ سر اقبال کی صحبت کے اثر سے فیضیاب ہوئے تو سنہ ۱۹۲۵ء میں 'مزدور اور سرمایہ داری' کے متعلق چند نظمیں لکھیں۔ اِن کا بہت تتبع ہوا۔ لیکن چونکہ تتبع تفریحی طور پر کیا گیا تھا۔ اسلئے

دیگر حضرات کو چنداں کامیابی نہ ہوئی۔ تاثیر کی طبیعت میں اُمنگ کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ اس لئے جب کبھی کسی صنفِ سخن کو اختیار کیا۔ اُس سے کچھ عرصہ کے بعد اُکتا گئے۔ اور جذبات کے اظہار کے لئے کوئی نئی راہ تلاش کر لی۔ چنانچہ حال ہی میں آپ نے گیت لکھنے شروع کئے ہیں۔ اردو نظم میں ہندی الفاظ کا امتزاج بجائے خود ایک پُرلطف تخلیق کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس پر اگر یہ کام تاثیر کی مساعی سے سرانجام پائے۔ تو ادبِ اردو میں وہ نادر اضافہ کے مترادف ہے چنانچہ حضرتِ تاثیر کے گیت خالص ہندوستانی جذبات کا دلکش عکس ہیں۔ مزدور کا گیت ایک ایسی تخلیق ہے جس کی مثال کسی زبان میں شاذ ہی دستیاب ہو سکے سہلِ ممتنع زبان میں اقتصادی مسائل کو مذہب جمالیات اور سیاسیات سے ٹکرایا گیا ہے۔ اور مزدور کے نقطۂ نظر کو سب سے بالا تر بنایا گیا ہے۔

نثر نویسی میں بھی تاثیر کو کمال حاصل ہے مستقل تصنیف کوئی نہیں لیکن مشہور مغربی مصنفین کے شاہکاروں کے تراجم کے علاوہ کئی طبعزاد مضامین لکھ چکے ہیں۔ فنِ مصوری پر اردو میں تنقید کے رواج کے آپ ہی ذمہ وار ہیں۔ تنقید کرنے کا ذوق نہائت شستہ ہے۔ تنقید میں مزاح اور طنز کے لطیف عنصر کو اس خوبی سے شامل کرتے ہیں۔ کہ آپ کے حُسنِ ذوق کی داد دینی پڑتی ہے۔ اور

گفتگو کرتے وقت تو مزاج اس قدر بدیہی ہوتا ہے۔ کہ حاضرین اگر ہر ایک بات پر قہقہے نہیں لگا سکتے۔ تو متبسم ضرور ہو جاتے ہیں۔ میرے استفسار پر اپنی تاریخ پیدائش کے متعلق کہتے ہیں "پیدائش کوئی ایسا اہم واقعہ نہ تھا۔ کہ تاریخ یاد رکھتا۔ سرکاری رجسٹروں میں ۲۰ر فروری ۱۹۰۲ء درج ہے لیکن آج کل سرکار کا اعتبار اُٹھ چکا ہے۔ فانی کا ایک شعر مجھے پسند ہے۔ اور وہ حسب حال ہے ؎

نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم
رہی یہ بات کہ ہم ہیں سو یہ بھی کیا معلوم"

"تذکرہ" میں اپنے ذکر کے متعلق ارشاد ہوتا ہے۔ "اس "تذکرہ" میں میرا تذکرہ کیا ضروری ہے طبی ضرورت ہے۔ تو خود ہی تکلیف فرمائیے۔ آپ بھی تو باخبر ہیں"

ملک کے کئی نوجوان انشا پردازوں میں ادبی روح پھونکنے کا سہرا تاثیر کے سر ہے، جب بھی آپ کو کسی نوجوان میں جوہر قابل کی جھلک نظر آئی۔ آپ نے اسکے ادبی ذوق کی تکمیل میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ چنانچہ اسی خیال سے آپنے بزمِ فروغِ اردو کی ترتیب و تنظیم کی جس میں نوجوان ادیب شامل ہوکر وقتاً فوقتاً اپنے ذوق کی تسکین کرتے رہتے ہیں۔ ادبی لحاظ سے یہ بزم ایسا شاندار کارنامہ ہے۔ جس پر حضرتِ تاثیر کو ہمیشہ ناز رہیگا۔

انتخابِ کلام

داغ سینہ پہ جو ہمارے ہیں — گل کھلائے ہوئے تمہارے ہیں

تم ہمارے نہیں ؟ نہیں نہ سہی — ہم تمہارے ہیں ہم تمہارے ہیں

جس طرح ہم نے راتیں کاٹی ہیں — اس طرح ہم نے دن گذارے ہیں

کوئی جدت نہیں حسینوں میں — ق — سب نے نقشے ترے اتارے ہیں

شاخِ گل ہو کہ موجِ غنچۂ آب — ان میں انداز سب تمہارے ہیں

تیری باتیں ہیں کس قدر شیریں — تیرے لب کیسے پیارے پیارے ہیں

حلقہ زن چاند ہے ترے در پر — رہگذر میں تری ستارے ہیں

میرے دل میں دبی ہوئی ہے آگ — شعر میرے نہیں شرارے ہیں

عمر بھر ہم انقلابِ آسماں دیکھا کئے

دشمنوں کے لطف جورِ دوستاں دیکھا کئے
کشتگانِ یاس وقت نزع کچھ کہتے تو کیا
دیر تک چپ چاپ سوئے آسماں دیکھا کئے
کون کہہ سکتا ہے کس امید پر لیکن یہ ہے
مرنے والے جانبِ در بے گماں دیکھا کئے
کس طرح صیاد پھیلاتا رہا دامِ فریب
سہمے سمٹے ہم اسیرِ آشیاں دیکھا کئے
اے سرابِ عقل! دشمن لے گئے دُرِّ مراد
اور ہم ساحل پہ ہی سود و زیاں دیکھا کئے

دورِ حیات

(ترکی شاعر خلیل کی ایک نظم کا ترجمہ)

گیا رہِ سبزۂ گلشن نے بگڑ کر | کہا اک زرد رو برگِ خزاں سے
سُن اے برہم کنِ بزمِ تخیل | نہیں کچھ فائدہ آہ و فغاں سے

تیرے گرنے میں ہے شورِ قیامت　　　یہ حشر انگیزیاں سیکھی کہاں سے
جگایا ہے مجھے خوابِ گراں سے
کیا محرومِ عیشِ جاوداں سے!

کہا برگِ خزاں نے لال ہو کر　　　ٹھکانہ ہے ترا تحت الثریٰ میں
تجھے بیگانگی سازِ طرب سے　　　تلاشِ نغمہ مجھ کو ہر صدا میں
سُن اے نا آشنائے رمزِ ہستی　　　ہے لطفِ زندگی میری نوا میں
جگا کر تجھ کو اِس خوابِ گراں سے
کیا محرومِ عیشِ جاوداں سے

یُونہی چلتا رہا دورِ آسماں کا　　　گیا مٹی میں رِل پتہ خزاں کا
بہار آئی ہوئی ہر رُوح تازہ　　　بنا پتہ خزاں کا سبز تنکا
مگر دورِ تسلسل زِندگی کا　　　سکوں دُنیا میں کب ہے رہنے دیتا
خزاں پھر آگئی اور ٹہنیوں سے　　　جُدا ہونے لگا ہر پتہ پتہ
وہ برگِ زرد یعنی سبز تنکا　　　یہ پت جھڑ دیکھ کر پتوں سے بولا
جگایا ہے مجھے خوابِ گراں سے
کیا محرومِ عیشِ جاوداں سے!

اِک نوجوان بیوہ کی تصویر دیکھکر

(جرمنی شاعر ہائینے کے چند اشعار کا ترجمہ)

یہ رنگت ہے کہ گل شرما گیا ہے　　نہیں شبنم پسینہ آگیا ہے

نگاہیں ہیں کہ بجلی ہے کہ سیماب　　فلک بھی دیکھ کر چکرا گیا ہے

یہ اُبھرا آ رہا ہے تیرا جوبن　　کہ طغیانی پہ دریا آگیا ہے

بہارِ بے خزاں ہے تو سراپا

مگر اِک دل ترا مرجھا گیا ہے

دو آتشہ

(عمر خیام کی ایک رُباعی کا ترجمہ)

خورشید کمندِ صبح بر بام انگند　　کیخسرِ روز مہرہ در جام افگند

مے خور کہ منادیٔ سحر گہ خیزاں　　آوازۂ "اشربو" در ایام افگند

(عمرِ خیام)

اب جاگ کہ شب کے ساغر میں سورج نے وہ پتھر مارا ہے
جو مے تھی وہ بہ نکلی ہے جو جام تھا پارہ پارہ ہے
مشرق کا شکاری اُٹھا ہے کرنوں کی کمندیں پھینکی ہیں
اک پیچ میں قصرِ اسکندر۔ اک پیچ میں قصرِ دارا ہے

ہاں دیکھ کہ مے خواروں کے من میں کیسی موج سمائی ہے
شیشوں کو کیا ہے چوُرا چوُرا مے کو آگ لگائی ہے
شعلے لرزاں۔ لرزاں رقصاں۔ رقصاں ہے، ہر ذرہ ذرہ
فرشِ زمیں سے عرشِ بریں تک ایسی جوت جگائی ہے

نغمہ

نرالی صورتوں والے نرالے ہیں حسیں نغمے
کئی عشرت فزا نغمے۔ کئی اندوہگیں نغمے
وہ چشموں کی نوا ریزی ستاروں کی ہم آہنگی

جدھر دیکھو ہیں بالائے فلک۔ زیرِ زمیں نغمے
سرِ کوہسار گوہر رنگ۔ گوہر بیز برفوں میں
ہوائے آبگوں کے سروقد۔ بالانشیں نغمے
کسی مسحور قلعے کے کسی تاریک گوشے میں
کسی محصورِ غم کے مضمحل اندوہگیں نغمے
کہیں دم توڑنے والوں کی بالاخیز فریادیں
کہیں گرداب سیلاب اجل کے تہ نشیں نغمے
کشادِ بال و پر کیسا بچھا ہو دام جب ایسا
کہیں نور اور کہیں نکہت کہیں رنگ اور کہیں نغمے

دہقان کا مستقبل

کڑکتی دھوپ میں کھیتوں میں دہقاں ہل چلاتا ہے
پسینہ بن کے خوں ہر موئے تن سے بہتا آتا ہے
بدن پر برچھیاں بن بن کے کرنیں شعلہ افگن ہیں

ابھی سے درپئے آسودگی یہ برقِ خرمن ہیں
خمیدہ آنکھ، تن بے پیرہن، تصویرِ مظلومی
سراپا دردِ حرماں، فکرِ کلفت، رنجِ محرومی
یہ سب کچھ ہے، یہ سب کچھ ہے مگر دیکھو اَنی ہل کی
زمیں کے سینۂ ہموار کو ہے چیرتی جاتی
اُڑے آتے ہیں انگاروں کی طرح خاک کے تودے
ابھی تھے اور نہیں ہیں ایک دم میں جھاڑیاں پودے
مگر روئے زمیں سے خستہ تر ہے قلب دہقاں کا
کہ ہے آماجگاہ صدیوں سے ظلم و جورِ انساں کا
یہ ایسا کھیت ہے تلوار کا ہل جس میں چلتا ہے
لہو کے سینہ میں برچھی بن کے ہر خوشہ نکلتا ہے
یہ بنجر کھیت، غیر آباد دل خاموش دہقاں کا
طلب رکھتا ہے خوشوں کی تمنائی ہے باراں کا
یہ دونوں ہاتھ مضبوطی سے جو تھامے ہوئے ہیں ہل
یہ خاموشی سے چلنے والے پاؤں غیر متزلزل

یہی آزاد کروائیں گے آقاؤں سے بندوں کو
یہ پاؤں روند دیں گے سرکشوں کو سربلندوں کو
یہ ہل ہموار کر دیں گے بلندی اور پستی کو
یہ مستقر بدل ڈالیں گے ویرانی میں بستی کو
نظر آتے ہیں تودوں کی طرح شاہی محل مجھ کو
دکھائی دیتے ہیں ارض و سما پر ہل ہی ہل مجھ کو

مزدور کا گیت

چکی پیسو - روٹی کھاؤ اپنی محنت کا پھل پاؤ
ہندو مسلم سب جھوٹے ہیں لایخل ہیں یہ الجھاؤ
ان جھگڑوں میں تم مت آؤ
چکی پیسو - روٹی کھاؤ

حُسن کی دُنیا حُسن کی دُولت! عیش و عشرت ناز و نعمت
خسرو اور فرہاد کو دیکھو لا حاصل ہے عشق میں محنت

خون پسینے پر نہ بہاؤ
چکی پیسو - روٹی کھاؤ

ہندی کا ہو ہندی آقا اچھا۔ صاحب۔ پھر کیا ہوگا
وہ کیا ہم سے کام نہ لیگا کام کی جب اُجرت ہے۔ پھر کیا؟
کام کرو اور خوب کماؤ
چکی پیسو - روٹی کھاؤ

نا ایسے ہیں۔ نا۔ ویسے ہیں یہ لیڈر بھی ہم جیسے ہیں
ان کو بھی ہے پیٹ کا دھندا ان کا مقصد بھی پیسے ہیں
ان کی باتوں میں مت آؤ
چکی پیسو - روٹی کھاؤ

گیت

تم بھی پیت کرو تو جانو

تم بھی پیت کرو تو جانو

ہم دُکھیوں کی فریادوں کو
دل سے ٹیسیں اُٹھے تو دل سے
تم بھولو سب بیدادوں کو - پیت کرو تو جانو
پیت کرو تم اپنے جیسے
سُندر صورت پتھر دل سے
در در سر ٹکراؤ جیسے
مستانی موجیں ساحل سے - پیت کرو تو جانو
پیت کے شعلے ایسے لپکیں
جل بجھ جائیں سب گن۔اوگن
نا کوئی اپنا نا کوئی دُوجا
نہ کوئی بیری نہ کوئی ساجن - پیت کرو تو جانو

مان بھی جاؤ

مان بھی جاؤ جانے بھی دو

چھوڑو بھی اب پچھلی باتیں
ایسے دن آتے ہیں کب کب
کب آتی ہیں ایسی راتیں - مان بھی جاؤ جانے بھی دو

دیکھو وہ پُورب کی جانب
نور نے دامن پھیلایا ہے
رات کی ظلمت دُور ہوئی ہے
سُورج واپس لوٹ آیا ہے مان بھی جاؤ جانے بھی دو
چھوڑو بھی اب پچھلی باتیں

جل جل کر مر جانے والے
پروانوں کا ڈھیر لگا ہے
یہ بھی لیکن دیکھا تم نے
شمع کا کیا انجام ہؤا ہے مان بھی جاؤ جانے بھی دو
چھوڑو بھی اب پچھلی باتیں

مان بھی جاؤ (واسوخت)

مان بھی جاؤ جانے بھی دو
چھوڑو بھی اب پچھلی باتیں
ایسے دن آتے ہیں کب کب
کب آتی ہیں ایسی راتیں - مان بھی جاؤ جانے بھی دو
مان بھی جاؤ تم کو قسم ہے
میرے سر کی اپنے سر کی
تم کو قسم ہے میرے دشمن
اپنے اُس منظورِ نظر کی مان بھی جاؤ جانے بھی دو
اُس کی قسم ہے جس کی خاطر
یُوں تم ہم کو بھُول گئے ہو
بھُول گئے ہو سارے وعدے
قول قسم کو بھول گئے ہو - مان بھی جاؤ جانے بھی دو
اچھا تم سچے میں جھُوٹا

اچھا تم جیتے میں ہارا
کیسا دشمن کس کا دشمن
جھوٹا تھا یہ قصہ سارا   مان بھی جاؤ جانے بھی دو

کب آؤگے پیتم پیارے

کب آؤ گے پیتم پیارے
کب آؤ گے پریم دوارے
رہ گئے پاؤں چلتے چلتے
تھک گئیں آنکھیں رستہ تکتے   کب آؤ گے پیتم پیارے

ایک کنارے محل تمہارے
ایک طرف ہم بپت کے مارے
بیچ میں ندی تند ہوائیں
کیسے آئیں کیسے جائیں   کب آؤ گے پیتم پیارے
پھول کھلے ہیں باغ میں ہر سُو

دُنیا میں پھیلی ہے خوشبو
اونچی اونچی ہیں دیواریں
کب تک سر دیوار سے ماریں — کب آؤ گے پیتم پیارے
کھانا پینا ۔ سونا کیسا
ہنسنا کیسا ۔ رونا کیسا
چار طرف چھائی ہے داسی
گھر میں رہ کر ہیں بن باسی — کب آؤ گے پیتم پیارے

حسرت کاشمیری

۱۹۰۴ء
(————)

چراغ حسن صاحب حسرت کاشمیری شیخ بدرالدین کے صاحبزادے ہیں آپ ۱۳۲۲ھ میں کشمیر کے ایک چھوٹے سے گاؤں بمیار میں پیدا ہوئے۔ جو بارہ مولہ سے چند میل ادھر دریائے جہلم کے کنارے واقع ہے۔ تام تاریخی ہے بچپن میں نانا نے گود لے لیا۔ چنانچہ اُنہیں کے دامن تربیت میں پرورش پائی۔ وہ خود شاعر تھے۔ اور حسن تخلص کرتے تھے۔ اُن سے اور اپنے والد بزرگوار سے ابتدا میں گلستاں اور بوستاں پڑھی۔ بعد میں سکندر نامہ، یوسف زلیخا، اور نیرنگ عشق کا مطالعہ کیا۔ عربی میں بھی کسی قدر استعداد بہم پہنچائی۔ انگریزی کی تعلیم کی تحصیل میٹرک تک پونچھ میں کی۔ جہاں آپ کے نانا بسلسلہ ملازمت مقیم تھے۔ اِس کے بعد منشی فاضل اور ایف۔ اے کے امتحانات میں خانگی طور پر شامل ہوئے۔

کچھ دنوں تک مختلف مدارس میں ہیڈ اور ینٹل ٹیچر کے فرائض انجام دیتے رہے

لیکن اس پیشہ سے دلی لگاؤ نہ تھا۔ اس لئے کلکتہ جاکر اخبار نویسی شروع کی! ور مختلف
مقتدر جرائد 'عصرِ جدید' 'نئی دنیا' 'جمہور' اور 'استقلال' کے فرائضِ ادارت انجام
دیتے رہے۔ کچھ عرصہ تک مولانا ابوالکلام آزاد کے اخبار 'پیغام' میں بھی کام کیا اور
پھر لاہور چلے آئے۔

لاہور 'آفتاب' کے نام سے ایک ماہانہ رسالہ جاری کیا لیکن اُسکی اشاعت
جاری نہ رکھ سکے۔

لاہور میں 'زمیندار' 'انصاف' 'احرار' اور کئی دیگر اخبارات کے اداروں سے
تعلق رہا۔ اور پھر دارالاشاعت پنجاب میں ملازم ہو گئے۔ جہاں کتابوں کی نظرِ ثانی
اور تہذیب نسواں کی ادارت کا کام آپکے سپرد ہوا۔ اسوقت آپ احسان کے ادارے میں شامل ہیں۔
آپکی مستقل اور بلند پایہ تصنیف 'تاریخ اسلام' ہے۔ اور کوئی کتاب لکھی
ہے۔ تو اپنے نام سے شائع نہیں کی۔ 'بغاوتِ عرب' کے نام سے ایک کتاب
شائع ہوئی۔ جو بہر حال اخبار نویسانہ ہے۔ رسالوں میں مضامین بھی بہت کم لکھے
ہیں لیکن چند ایک نہایت اعلےٰ پایہ کے طبعزاد افسانے لکھے ہیں۔ اور کچھ افسانوں
کے ترجمے کئے ہیں کو لمبس/ در سندھ باد جہازی کے فرضی ناموں سے مزاحیہ مضامین بھی لکھتے رہے ہیں نثر
میں زبان اور محاورہ کی صحت کا خاص خیال رکھتے ہیں۔

آپ کو کسی صاحب سے شرف تلمذ حاصل نہیں لیکن ایک دفعہ جب شاد
مرحوم کے حلقۂ تلمذ میں شامل ہونے کی خواہش کی۔ تو وہ بصارت اور سماعت سے
محروم ہونے کی وجہ سے آپ کی کوئی مدد نہ کر سکے۔ اور آپ کو اپنی پہلی حالت پر
قانع رہنا پڑا۔

آپ کا غزل کی طرف میلان زیادہ ہے۔ اور نہایت پاکیزہ شعر کہتے ہیں۔
بچوں اور عورتوں کے لئے بھی نظمیں لکھتے رہتے ہیں۔ کچھ سیاسی نظمیں بھی کہی ہیں۔ جو
"فارانی" اور "رلس بابا کاشمیری" کے فرضی ناموں سے شائع ہوئی ہیں۔

اس وقت آپ لاہور میں مقیم ہیں۔ اور ایک لاابالیانہ انداز سے زندگی گذارنے
میں مصروف۔ چشمِ ناظر پہلی نگاہ میں آپ سے ایک ایسی خشک متانت کا اثر اخذ
کرتی ہے۔ جس کو دُنیا کی کسی بڑی سے بڑی مسرت نے بھی خندہ زیرلب میں تبدیل
نہیں کیا۔ لیکن چند منٹ باتیں کیجئے۔ تو حسرت ٹھیٹھ دہلوی زبان اور انداز میں
چہکنے لگے گا۔ اور سراپا ابتہاج و مسرت نظر آئے گا۔ لیکن اس کے باوجود آپ کو
یہ شکایت ضرور رہے گی کہ اس انسان کو دُنیا کی کسی چیز سے دلچسپی نہیں۔ کیونکہ
اُس کا نظامِ عصبی ایسی برودت میں ملفوف ہے۔ جس کو متاثر کرنا آسان کام
نہیں۔

سخن فہمی اور شعر گوئی میں آپ کا مذاق نہایت شستہ اور لطیف ہے لیکن نمود سے اِس قدر متنفر ہیں کہ میرے اصرار کے باوجود آپ نے اپنے کلام کا نہایت مختصر انتخاب دیا ہے۔ جو ہدیہ ناظرین ہے۔

انتخابِ کلام

محبت کس قدر یاس آفریں معلوم ہوتی ہے
ترے ہونٹوں کی ہر جنبش "نہیں" معلوم ہوتی ہے

یہ کس کے آستاں پر مجھ کو ذوقِ سجدہ لے آیا
کہ آج اپنی جبیں، اپنی جبیں معلوم ہوتی ہے

محبت تیرے جلوے کتنے رنگا رنگ جلوے ہیں
کہیں محسوس ہوتی ہے، کہیں معلوم ہوتی ہے

جوانی مٹ گئی لیکن خلش دردِ محبت کی
جہاں معلوم ہوتی تھی وہیں معلوم ہوتی ہے

امیدِ وصل نے دھوکے دیئے ہیں اس قدر حسرت
کہ اس کافر کی ہاں بھی اب نہیں معلوم ہوتی ہے

دل بلا سے نثار ہو جائے　　آپ کو اعتبار ہو جائے
قہر تو بار بار ہوتا ہے　　لطف بھی ایک بار ہو جائے
دل پہ مانا کہ اختیار نہیں　　اور اگر اختیار ہو جائے

زندگی مختصر نہیں ہوتی　　شبِ غم کی سحر نہیں ہوتی
زندگی تو ہی مختصر ہو جا　　شبِ غم مختصر نہیں ہوتی

میرے دردِ عشق کو رسوا کیا　　آپ نے جو کچھ کیا اچھا کیا

عاشقی میں جی ہمارا جائے گا　　آپ کو کیا آپ کا کیا جائے گا

ڈرتا ہوں کہ اس چشمِ فسوں ساز کی گردش　　احساسِ تمنا کو تمنا نہ بنا دے

ٹکڑے نہیں یہ ابرِ سیہ کوہسار کے گیسو بکھر گئے ہیں عروسِ بہار کے

اے قیس دیکھ ناقۂ لیلےٰ نہ ہو کہیں بجلی سی اِک چمکتی ہے منزل کے سامنے
حسرت کو لے تو آئیں تری بزم ناز میں کمبخت رو نہ دے کہیں محفل کے سامنے

رات کی بات کا مذکور ہی کیا چھوڑیئے رات گئی بات گئی
اب کے برسات میں بھی پی نہ سکے ہم پہ روتی ہوئی برسات گئی

راہ میں اُن سے ملاقات ہوئی جس سے ڈرتے تھے وہی بات ہوئی

کس کو بھولیں گی یہ راتیں یاد آؤ گے، یاد کرو گے

غمِ آرزو کو نہ تازہ کر دلِ بے خبر یہ وہ آگ ہے
جو سُلگ اُٹھی تو سُلگ اُٹھی جو دبی رہی تو دبی رہی

ہماری نامرادی کا فسانہ — یہ کس کس کو سنایا جا رہا ہے

راستہ اپنی موت کا حسرت ایسے دیکھ رہا ہوں — جیسے شام فراق کے مارے اُٹھکے سحر کو دیکھتے ہیں

دم آخر وُہ آ گئے حسرت — موت سے اب کوئی بہانہ کریں

حسرت یہ بیخودی ہے کہ اتنی خبر نہیں — اُن کی نظر ہے یا ستم روزگار ہے

آپ کا ذکر بیٹھتے ۔ اُٹھتے — آپ کی یاد جاگتے سوتے
عشق نے حُسن کو بنایا حُسن — ہم نہ ہوتے تو آپ کیا ہوتے

قبول اُن بارگہ میں التجا کوئی نہیں ہوتی — الٰہی یا مجھی کو التجا کرنا نہیں آتا

پھر وُہی میں وہی نظر اُنکی — دیدہ و دل کی یاریاں نہ گئیں

میری جبین سجدہ ریز تیرا حریم ناز ہو — مجھ سا جنوں پرست ہو تجھ سا جنوں نواز ہو

روز دیتا ہے۔ مجھے داغِ جدائی اے چرخ — کیا تجھے اور کوئی طرزِ ستم یاد نہیں

اے عشقِ جنوں پرور اتنا تو ہؤا ہوتا — جو ہاتھ جگر پر ہے وہ دستِ دعا ہوتا

اِک عشق کا غم آفت اور اس پہ یہ دل آفت — یا غم نہ دیا ہوتا یا دل نہ دیا ہوتا

امید تو بندھ جاتی، تسکین تو ہو جاتی — وعدہ نہ وفا کرتے وعدہ تو کیا ہوتا

غیروں سے کہا تم نے غیروں سے سُنا تم نے

کچھ ہم سے کہا ہوتا کچھ ہم سے سُنا ہوتا

وقار انبالوی

(۱۹۰۴ء ـــــــ)

کاظم علی صاحب وقارؔ قصبہ ملانہ ضلع انبالہ کے رہنے والے ہیں۔ اور ۲۲ فروری ۱۹۰۴ء کو پیدا ہوئے تھے۔ آپ کے آباؤ اجداد نصیر الدین ہمایوں کے ساتھ ہندوستان آئے تھے۔ آپ کا شجرۂ نسب حضرت عیسیٰ بن اسحاق علیہ السلام سے ملتا ہے۔ ملانہ کو ان کے مورثِ اعلیٰ ملا محمد طاہر نے مغل بادشاہوں سے جاگیر میں پایا۔ اور اس کا نام عہدِ شاہجہان میں چناں رکھل سے بدل کر مغلانہ رکھا گیا۔ جو بعد میں ملانہ رہ گیا۔ آس پاس کی تمام آبادی راعین قوم سے تعلق رکھتی تھی۔ اس لئے ۱۹۱۸ء کے بندوبستِ اراضی میں ان کے بزرگوں نے زراعتی حقوق حاصل کرنے کے لئے اپنی قومیت راعین لکھوادی۔ پشت ہا پشت سے اِن کا ماحول خالص زراعتی رہا ہے جس کی جھلک حضرت وقارؔ کے کلام میں نمایاں طور پر پائی جاتی ہے۔

اِن کے داد اور اِن کی موجودہ بیوی[1] کے دادا (جو کہ آپس میں قریبی رشتہ دار تھے اور عہدِ انگریزی میں گزیٹیڈ افسر تھے) کو شعر و ادب سے بہت لگاؤ تھا۔ اِنکے باپ نے دہلی میں نواب احمد مرزا کی ایک عزیز سے شادی کر کے اپنے اردگرد ایک شیعی ماحول پیدا کر لیا۔ اور وقارؔ کے کان بچپن سے ہی میرانیسؔ اور دبیرؔ سے آشنا ہو گئے۔ اور ذوقِ وجدان میں شعر نے اپنی جگہ بنا لی۔ چنانچہ جب وہ چھٹی جماعت میں پڑھتے تھے۔ تو ایک جواب مضمون اِن اشعار پر ختم کیا۔

نہیں ایسے مضموں کا یارا مجھے　　لیاقت مری اتنی اچھی نہیں
مگر چند سطریں بدقت تمام　　غرض پاس ہونے کے تحریر کیں

اس پر ان کے ممتحن نے سو فیصدی نمبر دیئے۔ اور ہمت افزائی کرتے ہوئے کہا۔ کہ غزل کہا کرو لیکن وقارؔ غزل کہنے کے لئے پیدا نہیں ہوئے تھے۔ چنانچہ ان کی پہلی نظم جو "ہمایوں" (۱۹۲۶ء) میں شائع ہوئی۔ وہ خالص ہندوستانی نظم تھی اور اُس کا عنوان "باغ کی رانی" تھا۔

آپ شعر بہت بے تکلف کہتے ہیں۔ اور پُر گو ہیں۔ اب تک تقریباً ایک

---

[1] یہ ان کی چھٹی شادی ہے۔

لاکھ شعر کہہ چکے ہیں۔ جن میں سے اکثر وبیشتر ان کے نام سے شائع نہیں ہوئے۔ ان کے اشعار میں بیساختہ پن ہوتا ہے۔ جسے دیہاتی الفاظ کا بے تکلف استعمال اور خوبصورت بنا دیتا ہے باوجود اسکے کہ آپ ایک عرصہ سے لاہور میں مقیم ہیں۔ ابھی تک آپ شہری فضا سے مانوس نہیں ہوئے۔ چنانچہ آپ کی دو نظمیں "گاؤں" اور "لاہور" میرے اس خیال کی تائید کرتی ہیں۔ جن میں سے پہلی نظم میں آپ نے دیہاتی مناظر کی دلفریبیوں کا دلچسپ تذکرہ کیا ہے۔ اور آخری نظم میں لاہور کی جملہ رعنائیوں کی تفصیل بیان کرتے ہوئے اُن سے بیزاری کا اظہار کیا ہے۔ آپکی مستقل تصنیف عرف "آہنگِ رزم" ہے جو نہایت بلند پایہ رزمیہ نظموں کا مجموعہ ہے۔

آپ نثر نگار بھی ہیں۔ چنانچہ پرتاپ۔ ملاپ۔ ویر بھارت اور دیگر روزناموں میں اصلاحی۔ سیاسی اور تمدنی مضامین لکھتے رہتے ہیں۔ آپ نے چند ایک دلچسپ افسانے بھی لکھے ہیں۔ جن میں "چکر" اور "اکنی" خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

وقار کی نظم اور وقار کی شخصیت میں بُعد المشرقین ہے۔ وقار کی نظم پر خلوص جذبات کا پاکیزہ مرقع ہوتی ہے لیکن جب وہ گفتگو کرتا ہے۔ تو اس کا بیباک تبصرہ اور طعن وتشنیع سامع کی قوت برداشت کا پورا پورا امتحان لے لیتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود وقار ایک مخلص لسان ہے۔ جو کسی کو رنجیدہ کرنے کے باوجود اپنی معصومیت کی آڑ میں دوسروں کے رنج سے متاثر ہی نہیں ہوتا۔

انتخابِ کلام

گاؤں

گاؤں اے تہذیبِ انسانی کے نقشِ اولیں! زندگی کے دورِ عمرانی کے نقشِ اولیں!

منزلِ صحرائیت کی آخری حد کے نشاں تیرے ٹوٹے پھوٹے بیڈھنگے سے گارے کے مکاں

کہنہ دیواریں تری تاریخِ ماضی کے ورق تیرے مکتب سے ملا پہلا حضارت کو سبق

آدمی جنت سے نکلا تیرے دامن میں بسا اس مسرت اور آزادی کے دامن میں بسا

بحر و جنگل کا شناور تیرے ساحل پر رکا دشت و صحرا کا مسافر تیری منزل پر رکا

رہروانِ زندگی کی منزلِ اوّل ہے تو بارِ تہذیبِ بشر کا حاملِ اوّل ہے تو

رہنمایانِ بشر تیری ہی بستی سے اُٹھے مہر و ماہ و نجم کیا کیا تیری بستی سے اُٹھے

یہ ترے کچے گھروندے مسکنِ اشراف ہیں تیری چوپالیں ستونِ کعبۂ انصاف ہیں

بے ریا بھولے ترے معصوم اور سادہ مکیں محنت و اخلاص و دلداری کے دلدادہ مکیں

رُوح کا سامانِ عشرت تیرے دلکش گیت ہیں اور تری بستی کے باسی ہر کسی کے میت ہیں

نیند سے مخمور دلکش چاندنی راتیں تری
'پی کہاں' کے نور سے پُرنور برساتیں تری

دھوپ سے آباد تیری سردیوں کی ہر سحر
چھاؤں سے دِلشاد تیری گرمیوں کی دوپہر

تیری صبح و شام کا سادہ مگر دلچسپ رنگ
آدمی کے دل میں بس رہ رہ کے اُٹھتی ہے امنگ

ڈھاک کے پھول، آم کے پھل، چھاؤں ٹھنڈی نیم کی
رشک کھائے بادشاہت اس پہ ہفت اقلیم کی

لیکے چوپایوں کے گلّے خانۂ دہقان سے
پھرتے ہیں چرواہے اک پیغمبرانہ شان سے

کھیت میں خوددار مزدور اور جفاکش محنتی
جنکا مسلک ہے عمل اور جنکا مشرب سادگی

تیرے میدانوں کی زرخیزی سے دولت شرمسار
تیرے ویرانوں کی خاموشی پہ ہنگامے نثار

حُسنِ سادہ کی فسوں خیزی! الٰہی الاماں!
عشقِ صادق کی جنوں خیزی! الٰہی الاماں!

پاسدارِ عصمتِ مریم کنواری لڑکیاں
ناشناسِ فکرِ بیش و کم کنواری لڑکیاں

ناچتے ہیں گیت انکے محنتوں کے ساز پر
چٹکیوں کی منضبط اور دلربا آواز پر

اِک طرف ساون کی ہلکی ہلکی بوندوں کی پھوار
اِک طرف اِنکے سریلے مست گیتوں کی بہار

سردیوں کی لمبی راتوں میں فسانہ گوئیاں
گرمیوں کی دوپہر میں باہمی دلجوئیاں

شہر کے پُرشور ہنگاموں سے گھبراتا ہوں جب
رات دن کی کاہشِ پیہم سے اکتاتا ہوں جب

تیری جانب دوڑ کے بیساختہ آتا ہوں میں
دِل کا اطمینان اِس ماحول میں پاتا ہوں میں

تجھ سے وابستہ مرا سرمایۂ تاب و قرار
کچھ عزیزوں کے مکاں ہیں کچھ بزرگوں کے مزار

وقت کی رفتار مجھ کو یاں نظر آتی ہے سست
جسم کی بگڑی کلیں ہوتی ہیں یاں آکر درست

زندگی کی حرکتوں میں اک سکونِ دل نواز
شادمانی خرمی کا اک فسونِ دلنواز

تیرے میدانوں کی وسعت میں مرا ہر یک خیال
چار جانب دوڑتا ہے لیکے اور اک جمال

لطف اُٹھاتا ہوں تری روشن فضا میں بیٹھکر
گیت گاتا ہوں تری تازہ ہوا میں بیٹھکر

میری خواہش میری آسائش مری مرضی ہے تو
گاؤں کیا ؟ میری نظر میں جنتِ ارضی ہے تو

لاہور

دہاتی بے تکلف زندگی سے دل جو گھبرایا
مجھے میرا مقدر کھینچکر لاہور مے آیا

خدا کا نام لیکر ناخداؤں کے سہارے سے
میری کشتی چلی بحرِ تمدن کے کنارے سے

نگاہِ شوق کا گہوارہ تھیں تہذیب کی موجیں
خودی کے زور میں آوارہ تھیں تہذیب کی موجیں

تھپیڑے ہلکے ہلکے کھا رہی تھی عمر کی کشتی
کسی موہوم رُخ کو جا رہی تھی عمر کی کشتی

نگاہوں کیلئے جنت تھی اک ساحل کی شادابی
سراپا شوخیٔ فطرت تھی اک ساحل کی شادابی

ہر اک ذرے سے اک شانِ جمالی آشکارا تھی
کنارے پر جو شے موجود تھی وہ حسن آرا تھی

عجب رنگین لغزش تھی فضاؤں کی جوانی میں
سرور انگیز جنبش تھی ہواؤں کی روانی میں

گھٹاؤں سے برستی تھی شرابِ شعر کی مستی
سرور و کیف سے آباد تھی اک دل نشیں بستی

فروغِ شامِ عشرت سے ستارے ماند تھے یکسر
بتانِ نور پیکر اس زمیں کے چاند تھے یکسر

غبارِ راہ زریں تھا یہاں کی راہگذاروں کا
یہ بستی کیا تھی اک فردوس تھا عشرت شعاروں کا

سرافرازی پہ طعنہ زن یہاں کی خاک کا رتبہ
نگوں سر اس زمیں کے سامنے افلاک کا رتبہ

بہاریں باغ جن سے ساحر الموط شرمائے
نگاریں میکدے ایسے کہ کوثر کو بھی رشک آئے

مری حدِ نظر تک برق پارے رقص کرتے تھے
یہ ایسی سرزمیں تھی جس پہ تارے رقص کرتے تھے

سراپا ایک نغمہ جس کی موجوں میں دل آرائی
سراپا اک ترانہ جس کی تانوں میں جنوں زائی

نظر ساحل کی رنگینی میں گم تھی اور رواں کشتی
خدا جانے اسی عالم میں آنکلی کہاں کشتی

نظر سے ہو چلے اوجھل کنارے کے حسیں منظر
وہ دلکش دلربا منظر، دل آرا دلنشیں منظر

سفینہ میرا آ پہنچا اچانک تند دھارے پر
بہا جاتا تھا بیتابی سے موجوں کے سہارے پر

بگڑتے جا رہے تھے دمبدم تیور ہواؤں کے
نظر آیا حواس و ہوش گم ہیں ناخداؤں کے

نظر آیا کہ ہے تہذیب کی ہر موج طوفانی
بہا لے جائے گی کشتی کو اب دریا کی طغیانی

ہویدا تند موجوں سے تباہی کے قرینے تھے
تصنع کے بھنور تھے اور انسانی سفینے تھے

کہاں کی رہنمائی ناخداؤں کی لگاوٹ تھی
تکلف ہی تکلف تھا بناوٹ ہی بناوٹ تھی

مری حدِ نظر تک ایک عالم تھا اذیت کا
نظر آیا مجھے یاں نام ڈوبا آدمیت کا

کوئی کشتی اچانک جب بھنور میں آن پھنستی تھی
بھیانک موت کی آغوش میں تہذیب ہنستی تھی

مسرت غرقِ دریا تھی جوانی غرقِ دریا تھی
شرافت اور محبت کی کہانی غرقِ دریا تھی

یہاں آکر شجاعت بزدلی کا درس لیتی تھی
متانت خود بھنور کے رخ پہ کشتی موڑ دیتی تھی

ہلاکت چار سو تھی مرثیہ خوانِ توانائی
یہاں شرمندۂ ہیجان تھی شانِ شکیبائی

سیاست اپنے ڈورے ڈالتی تھی نوجوانوں پر
ہوا جاتا تھا اک جادو وطن کے پاسبانوں پر

یہاں گھٹنوں میں سر دیدیکے روتی تھی حیاداری
ہوس کے لاف زن لب پر تھا دعوائے وفاداری

مسافر مضطرب تھے ناخدا بے چین تھے سارے
دلِ انسانیت کا بار ارمانوں کے پشتارے

نہ کوئی کام بنتا تھا نہ کوئی کام آتا تھا
فقط رہ رہ کے ہونٹوں پر خدا کا نام آتا تھا

دعائیں تھیں کہ یارب پھر موافق کر ہواؤں کو
سفینے پھیرنے کی تاب دے اِن ناخداؤں کو

بہت بیتاب تھی دنیا مگر کچھ بس نہ چلتا تھا
مسافر کیا یہاں تو ناخدا بھی ہاتھ ملتا تھا

یہاں پہنچا تو میں نے عافیت کی قدر پہچانی
ہوا معلوم یہ تہذیب ہے روحِ پریشانی

جنہیں روح روانِ زیست سمجھا تھا وہ ہنگامے
کھڑے تھے میری چاروں سمت دامن موت کا تھامے

سرابِ ارتقا دیکھا، فریبِ آرزو کھایا
دلِ سادہ کو تکلیف و الم میں مبتلا پایا

گرے اخلاق اور نیکی کے جوہر اشک بن بنکر
اٹھا دل میں خیالِ سادگی پھر رشک بن بنکر

جوانی اور خودداری کا حاصل کھو دیا میں نے
دُرِ مقصد کہاں پایا، یہاں دل کھو دیا میں نے

"شبِ تاریک و بیمِ موج و گردابے چنیں حائل"
نہنگانِ اجل کی نیتیں بیداد پر مائل

خدا نے دی اگر توفیق اور میں بچ رہا زندہ
کروں گا عمر بھر تہذیبِ انسانی کو شرمندہ

سسرال میں دو راتیں

شہسوارِ چرخ آ پہنچا تھا منزل کے قریب
دن کی کشتی آ لگی تھی شب کے ساحل کے قریب

چومتی تھیں سبز کھیتوں کو شعاعیں بار بار
ہو طلا کاری کی جیسے سبز مخمل پر بہار

میری دن بھر کی مسافت بھی قریب الختم تھی
راہ کی الجھن مصیبت بھی قریب الختم تھی

گاؤں تھا میری نظر کے سامنے سسرال کا
صاف آتا تھا نظر پیپل مجھے چوپال کا

گاؤں والے کر چکے تھے ختم سب کھیتوں کا کام
گھاس کے گٹھے اٹھائے جا رہے تھے تیز گام

راستے میں کوئی آ ملتا تو ہو جاتا سلام
سادگی سے مسکرا کر مجھ سے یوں کرتا کلام

"گاؤں میں سب خیریت ہے؟ خوش تو ہیں چھوٹے بڑے
فصل کا کیا حال ہے؟ اولے دھڑے بھی ہیں پڑے؟

نوکری سے آئے کب؟ چھٹی ہے کتنے روز کی؟
شہر کا کیا رنگ ہے؟ کہئے ترقی کچھ ملی؟

خوش تو ہے لڑکی ہماری؟ اسکا دل بھی لگ گیا؟
گاؤں یاد آتا ہے اسکو؟ ہیرا کرتی ہے کیا؟

گاؤں کے نزدیک پہنچا کھیلتا ہنستا ہوا
مجھ سے ملتا تھا ہر اک چھوٹا بڑا ہنستا ہوا!

مسکراتے چہروں سے کرتے تھے استقبال لوگ
پوچھتے تھے مجھ سے خوش ہو ہو کے میرا حال لوگ

— — — — —

— — — — —

— — — — —

— — — — —

آن پہنچا منزل مقصود پر نیہوڑائے سر
دیکھتے ہی لوگ گھر کے مجھ سے لپٹے دوڑ کر

باری باری سب نے سر پر ہاتھ پھیرا پیار سے
لیں بلائیں ساس نے رہ رہ کے چوما پیار سے

— — — — —

حضرت مریم کی امت سالیاں ہمسائیاں
آگئیں بیوی کی سکھیاں خوبرو ہمجولیاں

ایک کچھ کہکر ہنسی اور دوسری کچھ کہہ گئی
بات تھی کوئی ہنسی میں ہی جو اڑ کر رہ گئی

ایک بولی چور ہو میری سکھی کو لے اڑے
مچ گئے کہتے ہی اتنا چار جانب قہقہے

— — — — —

ایک آئے خندہ رُو اور ایک جائے شادکام | چاؤ کی باتیں تھیں شب بھر اور تھے ہنسنے سے کام
شب کی ہر ساعت سرور و لطف سے معمور تھی | نیند کوسوں دور تھی اور بھوک کوسوں دور تھی

لطف کا لمحہ تھا ہر اک لطف تھا ہر بات میں
ساری دنیا کی خوشی کھنچ آئی تھی اس رات میں

دُوسری رات

پھر وہی رستہ مسافر بھی وہی منزل وہی | پھر وہی منظر نگاہیں بھی وہی اور دل وہی
میں وہی تنہا گاؤں والے بھی وہی گھر بھی وہی | تھی وہی چوپال بھی گلیوں کے چکر بھی وہی
گاؤں کے لڑکے وہی تھے لڑکیاں بھی تھیں وہی | سالیاں ہمسائیاں ہمجولیاں بھی تھیں وہی
تھیں وہی نظریں مگر ان میں وہ بیباکی نہ تھی | تھے وہی انداز لیکن ان میں چالاکی نہ تھی
میری جانب دیکھ کر ہنستا نہ تھا کوئی بشر | تھا کسی لب پر تبسم اور نہ شاداں تھی نظر
جس طرف جاتا تھا میں آنسو تھے یا آہیں تھیں سرد | دیکھ کر روتی تھیں مجھ کو عورتیں روتے تھے مرد

——— ——— ———

——— ——— ———

دل کڑا کر کے کوئی بولا تو بس اتنا کہا ۔۔۔ گاؤں سے اب اس بھلے مانس کا ساجھا اُٹھ گیا

گھر پہ جا پہنچا اسی عالم میں غمگیں اور اداس ۔۔۔ اِکّا دُکّا ہی کوئی اُس روز آیا میرے پاس

ساس روتے روتے اُٹھی دیکھ کر صورت مری ۔۔۔ اور پوچھا "میری بچّی موہنی مورت مری

چھوڑ آئے ہو کہاں اُسکو؟ کہو وہ خوش تو ہے ۔۔۔ کوئی پیغام اُسکا ہے؟ مانگی ہے اُسنے کوئی شے؟"

اِتنا سنتے ہی کلیجے میں لگا اِک تیر سا ۔۔۔ خونِ دل دل سے اُٹھا آنکھوں کے رستے بہ گیا

میں کہ اِک دِن سینکڑوں باتوں کا دیتا تھا جواب ۔۔۔ تھا نہ میرے پاس اِس معصوم فقرے کا جواب

ساس اور داماد دونو رو رہے تھے زار زار ۔۔۔ روتے روتے بندھ گیا دونو طرف ہچکی کا تار

رات آئی گاؤں بھر پر اِک خموشی چھا گئی ۔۔۔ روتے روتے تھک گیا تو اونگھ مجھ کو آ گئی

شب کے سناٹے میں پیہم ہچکیاں وہ ساس کی ۔۔۔ روح زخمی ہو رہی تھی فطرتِ حساس کی

نکلا پڑتا تھا مرا دم گویا ہر ساعت کے ساتھ ۔۔۔ کاٹنے کو رات کاٹی پر بہت آفت کے ساتھ

آہ وہ رُوحِ مسرّت آہ وہ جانِ نشاط ۔۔۔ جسکے دم سے تھا یہ گھر فردوس و ایوانِ نشاط

آج مجھ سے دُور تھی اِس غم کی دُنیا میں نہ تھی ۔۔۔ اور کیا ہوتا وہی جب میری دُنیا میں نہ تھی

حضرتِ وقارؔ نے چند ایک گیت بھی لکھے ہیں۔ جو کسی ہندی دل گداختہ کے پُرسوز نوحے ہیں۔ اِن میں ایک مندرجہ ذیل ہے۔

پپیہا

اساوری میں ایک گیت

کوک پپیہے کوک

بادل گرجے رات اندھیری　　سُونی سونی دُنیا میری

جینا میرا ہوگیا دوبھر

آنکھ لگے نہ بھُوک ـــ پپیہے ! کوک پپیہے کُوک۔

(۲)

تو بن باسی کھل کر روئے　　میرا رونا مجھ کو ڈبوئے

تیری طرح سے نیہہ لگایا

چُوک گئی میں چوُک ـــ پپیہے ! کُوک پپیہے کُوک۔

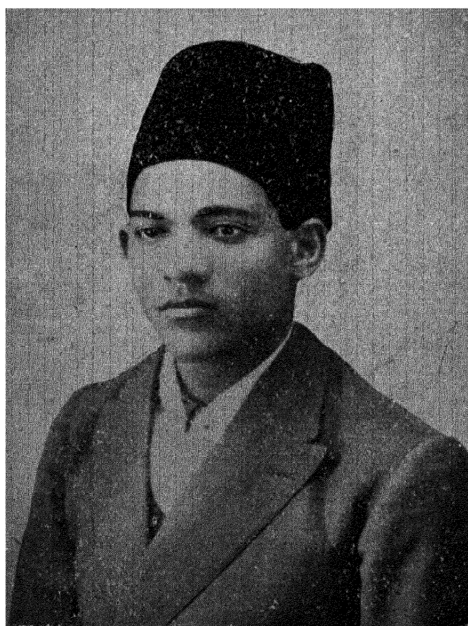
(۳)

میں بھی اکیلی تو بھی اکیلا   موہ کا ساگر دکھ کا ریلا
تیرے گلے میں پی کا پھندا
میرے من میں ہوک ۔۔ پپیہے اکوک پپیہے کوک

پیا بن ناگن کالی رات

(ایک بند)

گھر کے باہر آم کھڑا ہے   سائیں سائیں ہو
ٹہنے اُسکے بھوت بنے ہیں   ناگن کے پھن ہیں پات
پیا بن ناگن کالی رات



جلال الدین اکبر

اکبؔر

(سنہ ۱۹۰۵ء ————)

چوہدری جلال الدین صاحب اکبؔر علیوال نہراں والا ضلع گورداسپور کے رہنے والے ہیں۔ اور ستمبر سنہ ۱۹۰۵ء میں ہفتہ کے روز پیدا ہوئے تھے۔ آپ کے والد چوہدری فتح علی مرحوم شہ زوری میں شہرہ آفاق تھے۔ اور سیر چشمی اور فیاضی کی بدولت اپنے علاقہ میں مشہور تھے۔ یہاں تک کہ یہ سخاوت اور فیاضی غلط بخشی کی حد تک پہنچ گئی تھی۔ اور آپ اپنی جائداد وغیرہ اپنے اقربا کو دے کر خود ساری عمر افلاس و عسرت میں گذارتے رہے۔

اکبؔر نے ابتدائی تعلیم کی تکمیل اپنے گاؤں میں کی۔ اور میٹرکولیشن کا امتحان ایم۔ بی۔ ہائی اسکول (اب اس کا نام ڈی۔ بی۔ ہائی اسکول ہے) گوجرہ سے پاس کیا بعد میں گورنمنٹ کالج، لاہور میں داخل ہوئے۔ جہاں سے بی۔ اے (آنرز) کا امتحان پاس کیا۔ طالب علمی کے دوران میں تقریباً ہر درجہ میں خداداد ذہانت کی وجہ سے وظیفہ

پاتے رہے ہیں۔ چونکہ ابتدا سے طبیعت علمی اور تعلیمی زندگی کی طرف راغب تھی۔
اسلئے سنٹرل ٹریننگ کالج، لاہور سے معلمی کی سند حاصل کر کے ۱۹۳۰ء میں اسلامیہ
ہائی اسکول شیرانوالہ دروازہ، لاہور میں ملازم ہو گئے۔ بعد میں انجمن حمایت اسلام لاہور
کے ایک مقامی سکول میں ہیڈ ماسٹر مقرر ہو گئے۔

شاعری سے بچپن سے ہی لگاؤ تھا چنانچہ کم سنی کے زمانہ میں بھی پنجابی کے
بے شمار اشعار یاد تھے چھٹی جماعت میں اردو شاعری کی ابتدا کی۔ اور اُس وقت
مسعودؔ تخلص کیا۔ لیکن بعد میں اپنے ایک عزیز چودھری محمد شفیع صاحب بی۔ اے
ایل۔ ایل۔ بی۔ (علیگ) کی تجویز پر مسعودؔ کو اکبرؔ سے بدل دیا۔ اور اس وقت سے
اب تک اکبرؔ تخلص کرتے ہیں۔ ثانوی تعلیم کی تحصیل میں مصروف ....
تھے کہ غزل کہنی شروع کی۔ جب لاہور آئے۔ تو ادبی حلقوں میں آپ کے اشعار
بہت مقبول ہوئے۔ اور ملک کے متقدر جرائد میں آپ کا کلام شائع ہونا شروع ہو

۱۹۲۷ء میں جب مولوی منصور احمد صاحب نے رسالہ 'ہمایوں' کی ادارت
سنبھالی۔ تو اکبرؔ ان سے متعارف ہوئے۔ شناسائی بڑھتے بڑھتے نہایت گہرے
تعلقات میں تبدیل ہو گئی۔ اور منصور صاحب انکے کلام کو ہمایوں میں شائع کرنے
لگے۔ اکبرؔ کہا کرتے ہیں "اُس وقت سے جب کچھ لکھا ہے۔ وہ پہلے منصور کو دکھ

لیا ہے۔ اور پھر شائع کیا ہے"۔ چنانچہ اکبر کی بہترین نظمیں اور غزلیں ہمایوں میں ہی شائع ہوئی ہیں۔ اکبر اپنے تعلقات کا ذکر کئی دفعہ اپنے اشعار میں بھی کرتے ہیں۔ ملاحظہ ہوں :۔

ہر چند کہ مہجور رہوں مسرور ہوں میں — سرتا بقدم یار سے معمور ہوں میں
ہر قطرۂ خوں میں ہے انا الحق کا خروش — سرمستِ شرابِ شوقِ منصور ہوں میں

اکبر کے سوانح حیات میں تعجب انگیز امر یہ ہے۔ کہ آپ کے سب سے پہلے استاد ایک صاحب سردار امر سنگھ صفدر تھے۔ جو شاعری سے بالکل نابلد تھے۔ لیکن اکبر کو اصلاح دیا کرتے تھے۔ افسوس ہے۔ کہ اکبر کے پاس اُن کی کوئی اصلاح شدہ غزل موجود نہیں۔ ورنہ پتہ چلتا۔ کہ کہاں تک اُن کی نوازشیں اکبر کے لئے مفید ثابت ہوئی ہیں۔ اکبر کے دوسرے استاد فاضل ادیب علامہ فیروز الدین احمد طغرائی مرحوم تھے۔ لیکن ان سے استفادہ بہت کم کیا ہے۔ البتہ اپنے تیسرے استاد سید عابد علی صاحب۔ ایم۔ اے ایل۔ ایل۔ بی پروفیسر دیال سنگھ کالج لاہور (سابق پروفیسر کرسچین کالج لاہور) کے بہت ممنون ہیں۔ کیونکہ ان کے کلام کی بیشتر اصلاح انہوں نے کی ہے۔ چنانچہ اکبر کا دیوان "نقش ارژنگ" ۱۹۲۵ء میں انہی کی نظر ثانی کے بعد شائع ہوا تھا۔ اکبر علامہ سلیمان ندوی کے بھی مرہونِ منت ہیں۔ کہ وہ انہیں خطوط کی وساطت سے شعر و سخن

کے بہت سے نکات سکھاتے رہے ہیں۔

اکبرؔ نے اردو کے موجودہ شاعروں میں سب سے زیادہ حسرتؔ موہانی کا مطالعہ کیا ہے۔ اور انہی کا رنگِ سخن اِن کی شاعری میں جاری وساری ہے۔ چنانچہ ان کے دیوان پر تنقید کرتے ہوئے تمام نقادوں نے متفقہ طور پر لکھا تھا۔ کہ اکبر شاعری کے لحاظ سے حسرتؔ ثانی ہیں۔ حضرت نیازؔ فتحپوری مدیرِ نگار (لکھنؤ) نقش ارژنگ پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"داغ اور امیر کی وفات کے بعد اُن کی جانشینی کے متعلق انکے شاگردوں میں جھگڑا ہوا۔ مگر مقام شکر ہے۔ کہ حسرتؔ کی زندگی ہی میں اس کی جانشینی کا فیصلہ ہوگیا کیونکہ حسرتؔ کے رنگ میں اکبر بہترین کہنے والا ہے۔"

تصنیف

۱۔ نقش ارژنگ۔ یہ حضرت اکبر کا دیوان ہے۔ جو آپ کے ابتدائی کلام پر مشتمل ہے۔ اس کی اشاعت ۱۹۲۵ء میں ہوئی تھی ملک کے جملہ نقادوں نے اکبرؔ کے کلام کی داد دی تھی۔ اس سلسلہ میں مولوی عبدالحق صاحب مدیرِ اُردو، علامہ نیازؔ فتحپوری مدیرِ نگار اور علامہ سید سلیمان ندوی مدیرِ معارف کا نام لینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

جنہوں نے بہترین تقریظیں کتاب پر لکھی تھیں۔ اور اکبر کی شاعری کی داد دی تھی۔

انتخابِ کلام

اکبرؔ نے خود بھی اپنے کلام کے متعلق گاہے گاہے رائے کا اظہار کیا ہے۔ قارئین کی دلچسپی کے لئے ابتدا میں چند ایک ایسے اشعار درج کئے گئے ہیں۔ جو ان اشعار کا انتخاب ہیں۔

ترے اشعار میں اکبرؔ سراسر　　نمایاں رنگِ حسرت دیکھتا ہوں

پہروں اسے سنتے رہے سنکر وہ سر دھنتے رہے　　اکبرؔ زبس دلچسپ تھا میرا بیان عاشقی

میرا کلام نغز ہے روح روانِ شاعری　　میری نوائے درد ہے نغمۂ سازِ عاشقی

کیا عجب حضرتِ اکبر کا کلامِ رنگیں　　خاتم شعر میں مانندِ نگیں ہو جائے

نغمۂ گل طرازِ اکبرؔ ہے | ہیں بساطِ سخن پہ پھول ہی پھول

مصیبت لاکھ ہوں میرا قدم رہ سے نہیں ہٹتا | محبت بے نیازِ ایں و آں معلوم ہوتی ہے
یہ کس کا کاروانِ ناز گذرا آسمانوں سے | بہارِ کہکشاں جنت نشاں معلوم ہوتی ہے
فسانے قیس کے کچھ آشنا معلوم ہوتے ہیں | کتابِ عشق دل کی داستاں معلوم ہوتی ہے

مرے دیر آشنا کو مجھ سے الفت ہوتی جاتی ہے | تمنا دل کی پامالِ مسرت ہوتی جاتی ہے
وہ ظلمِ ناروا کے ذکر پر شرمائے جاتے ہیں | شکایت بھی مجھے وجہِ ندامت ہوتی جاتی ہے

ہو گیا حسن شرمسارِ وفا | عشق نادم ہوا گلا کر کے
آئے تسکینِ اضطراب کو وہ | اور بھی کچھ چلے سوا کر کے

جدا ہیں مجھ سے وہ لیکن نہیں پھر بھی جدا مجھ سے | مرا دل اُن میں رہتا ہے وہ میرے دل میں رہتے ہیں
تصور کی خیال آرائیاں دل سے نہیں جاتیں | نکل کر تیری محفل سے تری محفل میں رہتے ہیں

بے صرفہ کٹ رہے ہیں یہ زندگی کے دن ذوقِ گناہ و لطفِ ندامت نہیں مجھے
خاموش ہوں کہ واقفِ آدابِ عشق ہوں کیا کیا کسی سے ورنہ شکایت نہیں مجھے
کافر ہوں گر نہ ہو ترے وعدے کا اعتبار لیکن کچھ اعتبارِ قیامت نہیں مجھے

ہر آن ایک تازہ شکایت ہے آپ سے اللہ مجھ کو کتنی محبت ہے آپ سے
کیا آپ جانتے ہیں مجھے تو خبر نہیں کہتے ہیں لوگ مجھ کو محبت ہے آپ سے
اس دل کی آرزوئے محبت کو کیا کہوں جس دل کو آرزوئے محبت ہے آپ سے
رونا تو ہے یہی کہ نہیں آہ میں اثر شکوہ ہے آپ سے نہ شکایت ہے آپ سے

بیتابیٔ فراق میں میرا یہ حال تھا مرنا محال تھا مجھے جینا وبال تھا
دو دو اثر شکایتِ بیداد کے ہوئے وہ منفعل تھے خود بھی مجھے انفعال تھا
آغوشِ منتظر میں کوئی تو ضرور تھا اب جانے وہ تھے یا مرا حُسنِ خیال تھا
ہر چند اُن سے عرضِ تمنا نہ کر سکا ہر مُو مرے بدن پہ زبانِ سوال تھا

تاروں میں حُسن ہے نہ ہے خورشید و ماہ میں کچھ ہے اگر تو دیکھنے والی نگاہ میں

یادِ گناہ و اشکِ ندامت میں لطف ہے — ورنہ نہیں ہے خاک بھی لذت گناہ میں
للہ سہل کر مری دشواریٔ حیات — اے آرزوئے مرگ ہوں تیری پناہ میں
بزمِ شراب تک جو رسائی نہ ہو سکی — خاموش ہو کے بیٹھ رہے خانقاہ میں
اس جبر پر بھی ہے اُسے احساسِ اختیار — اِک انفعال سا ہے دِل عذر خواہ میں
یہ زندگی حیات ہے یا موت ہے حیات — گذری تمام عمر اِسی اشتباہ میں

اکبرؔ کو ایسے منزلِ مقصود مِل چکی
بیٹھا ہے پاؤں توڑ کے کم بخت راہ میں

آرزوئے اثر نہ ہو جائے — دردِ دل دردِ سر نہ ہو جائے
شبِ غم کی سحر نہ ہو جائے — زندگی مختصر نہ ہو جائے
آپ کا اہتمامِ پردہ کہیں — عشق کا پردہ در نہ ہو جائے
جوشِ سجدہ میں سر کہیں میرا — آپ کا سنگِ در نہ ہو جائے
حُسن کی بدگمانیاں توبہ — عاشقی معتبر نہ ہو جائے
نگہِ شوق اس قدر بھی نہ دیکھ — ان کو اپنی خبر نہ ہو جائے

ضبطِ الفت کی تاب ہے مجھ کو
بدگماں تو اگر نہ ہو جائے

خاموش ہیں لب اور آنکھوں سے آنسو ہیں کہ پیہم بہتے ہیں
ہم سامنے اُن کے بیٹھے ہیں اور قصّۂ فرقت کہتے ہیں

اب حُسن و عشق میں فرق نہیں اب دونو کی اِک حالت ہے
میں اُن کو دیکھتا رہتا ہوں وہ مجھ کو دیکھتے رہتے ہیں

اُن کی وُہ حیا وہ خاموشی اپنی وہ محبت کی نظریں
وہ سننے کو سب کچھ سنتے ہیں ہم کہنے کو سب کچھ کہتے ہیں

اِس شوقِ فراواں کی یارب آخر کوئی حد بھی ہے کہ نہیں
انکار کریں وُہ یا وعدہ ہم راستہ دیکھتے رہتے ہیں

ہمدرد نہیں ہم راز نہیں کس سے کہیئے کیونکر کہیئے
جو دل پہ گذرتی رہتی ہے جو جان پہ صدمے سہتے ہیں

آ دیکھ کہ ظالم فرقت میں کیا حال مرا بے حال ہُوا
آہوں سے شرارے جھڑتے ہیں آنکھوں سے دریا بہتے ہیں

اکبرؔ شاید دل کھو بیٹھے وہ جلسے وہ احباب نہیں
تنہا خاموش سے پھرتے ہیں ہر وقت اداس سے رہتے ہیں

قطعہ بند

کیا جانئے کہ کیوں ہوا دل اُنکا مبتلا　　کیا جانئے کہ کیوں وہ ہوئے اس قدر عزیز
حالانکہ اُن کی خوئے وفا ناشناس سے　　ہیں شکوہ سنج دوست اِدھر اور اُدھر عزیز

بعدِ یک عمر جُدائی جو ملے ہیں باہم　　اب میں کیا تم کو بتاؤں مری غفلت کیا تھی
اب میں کیا تم کو بتاؤں کہ تھی فرقت کیا شے　　اب میں کیا تجھ کو بتاؤں کہ اذیت کیا تھی
اب میں کیا تم کو سناؤں دلِ پُرغم کی حدیث　　اب میں کیا تم کو بتاؤں مری حالت کیا تھی
اب مجھے یاد بھی ہوں تیرے ستم کی باتیں　　اب میں کیا تم کو بتاؤں کہ شکایت کیا تھی

ہیں ترے جور بھی سرمایۂ نازِ اُلفت
لطف کی تجھ کو مری جان ضرورت کیا تھی

رُباعیات

مشتاقِ جمال ہیں نگاہیں میری　　اشراقِ جمال ہیں نگاہیں میری

طاری ہے جہان پر مرا حُسنِ نظر　　خلاقِ جمال ہیں نگاہیں میری

پامال تو ہمات عصیاں ہوں میں　　افکارِ عبادات میں حیراں ہوں میں
لا جامِ ہوش رُبا دے ساقی　　غمہائے دو عالم سے پریشاں ہوں میں

آزردگیٔ شوق

رہے اُس شوخ سے آزردہ ہم چندے تکلف
تکلف برطرف تھا ایک انداز جنوں وہ بھی　　(غالبؔ)

تجھے یقینِ محبت نہیں قیامت ہے　　یہ رنگ لائیں مری سرگرانیاں توبہ
تجھے عبورِ حقیقت نہیں مصیبت ہے　　یہ بیدلی یہ تری بدگمانیاں توبہ
یہ سمجھی تو مرے اندازِ سرگرانی سے　　کہ اِسکا دل نہیں لذت شناسِ اُلفت کا
یہ جانا تو نے مری بیہدہ بیانی سے　　کہ اِسکے دل میں نہیں کوئی پاسِ اُلفت کا
وفا سے جان لیا تُو نے نابلد مجھ کو　　تجھے خبر ہی نہیں شیوۂ جنوں کیا ہے
نہیں ہے رمزِ محبت سے آگہی تجھ کو　　جو اِذن ہو تو میں اجمال سے کہوں کیا ہے

وفا کا شکوۂ باطل سے آشنا رہنا — وفورِ سوزِ تمنا کی یہ علامت ہے
گلے نہیں یہ ہے سرگرمِ التجا رہنا — ہجومِ شوقِ جنوں زا کی یہ علامت ہے
ہیں اقتضائے محبت یہ خفگیاں میری — کمالِ شوق ہے آزردگی تمنا کی
نہیں ہیں واقفِ تسلیم شوخیاں میری — کہ یہ ہے اصل میں افسردگی تمنا کی
ترے سوا مجھے اے جاں کسی سے کیا مطلب — ترے جمال کا وارفتۂ محبت ہوں
مرے جنون کو بے رہروی سے کیا مطلب — جہانِ عشق میں قبلہ نما کی صورت ہوں

مری وفا پہ تجھے اشتباہ ہے پیاری
گناہ ہے یہ سراسر گناہ ہے پیاری

عابدؔ

(ـــــــــ سنہ ۱۹۰۶ء)

سید عابد علی صاحب عابدؔ لاہور کے رہنے والے ہیں۔ اور وہیں ۱۷ ستمبر سنہ ۱۹۰۶ء کو پیدا ہوئے تھے۔ ابتدائی تعلیم ڈیرہ اسمٰعیل خاں میں پائی ہے۔ جہاں اُنکے والد محکمۂ فوج میں ملازم تھے۔ بعد میں رنگ محل ہائی اسکول لاہور میں تعلیم پاتے رہے۔ اور پنجاب یونیورسٹی سے۔ ایم۔ اے (فارسی) اور ایل۔ ایل۔ بی کے امتحانات بالترتیب سیکنڈ کلاس اور فرسٹ کلاس میں پاس کر چکے ہیں۔

بی۔ اے کے بعد آپ رسالہ "دلکش" اور "ہزار داستان" کی ادارت کے فرائض سرانجام دیتے رہے۔ ہزار داستان حکیم احمد شجاع صاحب کی ادبی مساعی کا ایک گرانقدر ثمر تھا۔ اس میں بلند پایہ مضامین کی نشر و اشاعت ہوتی تھی علاوہ ازیں یہ اردو کا پہلا رسالہ تھا جسمیں خالص اردو افسانوی ادب کی اشاعت کا التزام کیا گیا تھا۔ پنجاب اور بیرون پنجاب کے بہترین مضمون نگار اپنی دماغی کاوشوں کے

نتائج کو اس کے لئے وقف کئے ہوئے تھے حضرتِ عابدؔ نے بھی اُن دنوں کافی افسانے لکھے جن کو بعد میں جمع کر کے کتاب کی صورت میں بھی شائع کیا گیا تھا۔

'ہزار داستان' کے زمانہ کے بعد حضرتِ عابدؔ کا مطالعہ کا دور شروع ہوا۔ اور اُس وقت اُنہوں نے انگریزی اور عربی کے تنقیدی ادب کا مطالعہ کیا۔ اس اثنا میں آپ کو ایم۔ اے کا امتحان دینے کا بھی خیال پیدا ہوا جس کی بدولت آپ کا ذوقِ مطالعہ تفحص و تحقیق کی حد تک پہنچ گیا۔ چنانچہ آپ نے عمرِ خیام پر ایک معرکتہ الآرا مضمون بعنوان "عمرِ خیام اور اُسکا عہد" لکھا۔ یہ مضمون ادبی دُنیا کی مسلسل آٹھ اشاعتوں میں شائع ہوا۔ اور اس قدر وقعت کی نگاہوں سے دیکھا گیا۔ کہ اسکا ترجمہ بنگالی زبان میں بھی شائع ہوا۔

ایم۔ اے کی تکمیل کے بعد سید صاحب دیال سنگھ کالج' لاہور میں ادبِ فارسی کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ اور دو سال کے بعد انگریزی بھی پڑھانے لگے۔ دیال سنگھ کالج میں چار سال تک کام کرنے کے بعد کرسچین کالج' لاہور میں شعبۂ السنۂ شرقیہ کے صدر ہو گئے۔ جہاں کچھ عرصہ کام کرنے کے بعد دیال سنگھ کالج میں واپس چلے آئے۔

ہزار داستاں کے دور میں جو نظمیں اور غزلیں حضرتِ عابدؔ نے لکھی ہیں وہ خالص غنائی ہیں یعنی ان میں الفاظ کی موسیقی اور دلکشی کی طرف زیادہ میلان

ظاہر کیا گیا ہے۔ اور جوانی کے رومان بھرے جذبات نہائت بے باکی سے نظم کئے گئے ہیں۔ اس دور کی شاعری میں حسرت موہانی کا اثر زیادہ نمایاں ہے لیکن اس میں مسائل حیات سے قطعاً بے اعتنائی روا رکھی ہے۔ جوانی کے دن تھے۔ عام غنائی شاعروں کی طرح انکے الفاظ بھی عشق و محبت کے محور پر گردش کرتے رہے۔

۱۹۲۲ء میں ان کی شاعری میں انقلاب عظیم پیدا ہوا۔ اب سید صاحب زندگی کے متعلق اپنا ایک نقطۂ نظر قائم کر چکے تھے۔ جو رجائیت پر مشتمل تھا۔ اور وہ بھی ذاتی رجائیت نہیں۔ بلکہ کائناتی یعنی ان کو اہم مسائل حیات میں ایک توازن ایک ہم آہنگی نظر آتی تھی۔ اب انکے معانی اور الفاظ یکساں طور پر سموئے گئے تھے یعنی حسین و دلکش الفاظ میں لطیف و نفیس معانی آپ کے اشعار کی خصوصیت بن گئی تھی۔ اس دور کی شاعری میں موسیقی اور ترنم کا جزو بھی شامل ہے۔ جو غالباً ان کی مہارتِ موسیقی کا نتیجہ ہے چنانچہ آپ نے چند ایک گیت بھی مخصوص راگوں میں لکھے ہیں۔ اس دور میں انکا کلام اتنا اچھا تھا اور اسی لئے اتنا کم ہے کہ 'ادبی دنیا' کے سوا کسی رسالے میں شائع نہیں ہوا۔

اردو شاعری کو 'ساقی نامہ' سے روشناس کرانے کے بھی آپ ہی ذمہ دار ہیں

اس ساقی نامہ میں آپ نے اپنے امتیازی اسلوب فکر کو قائم رکھتے ہوئے فارسی ساقی ناموں کے اصول کی پیروی کی ہے لیکن ساقی نامے کی معاشرتی فضا خالص پنجابی ہے

عابدؔ مخلص دوست اور فراخدل انسان ہیں۔ طبیعت میں فیاضی کوٹ کوٹ کر بھری ہوتی ہے۔ گفتگو تحریر سے بھی زیادہ شگفتہ اور پُرلطف ہوتی ہے۔ گھنٹوں باتیں سنتے رہیئے تو طبیعت سیر نہیں ہوتی۔ اعلےٰ درجہ کے نقاد ہیں۔ اور تنقید کرتے ہوئے اپنی فطری بذلہ سنجی سے دلچسپی کا سامان بہم پہنچاتے رہتے ہیں لیکن زبان پر قابو اس قدر ہے کہ "سیفو" اور "اوسکر وائلڈ" کے مذاکرات بھی اِس پُرلطف انداز میں بیان کرتے ہیں۔ کہ آپ کو ان کے مشرب کی داد دینی پڑتی ہے۔

تصنیفات

۱۔ حجاب زندگی اور دوسرے افسانے۔ یہ ہزار داستان کے دور کے افسانوں کا مجموعہ ہے۔ جو اِس عنوان سے شائع کیا گیا ہے۔ اس مجموعہ کے افسانوں پر سب سے زیادہ اثر پہلے طباع انگریزی مصنّف اوسکر وائلڈ کا ہے۔ ان میں گناہ کے مختلف پہلوؤں کو صناعانہ نظر سے دیکھا گیا ہے۔ زبان اس قدر ٹکسالی ہے کہ اہلِ زبان کے لئے بھی یہ امتیاز کرنا دشوار ہے۔ کہ اِنکا مصنف پنجابی ہے۔ چنانچہ معارف میں جو تنقید اس کتاب پر شائع ہوئی تھی۔ اُس میں سیّد صاحب کو علیگ لکھا گیا تھا۔

۲۔ قسمت اور دوسرے افسانے۔ یہ مجموعہ بھی افسانوں کا ایک اور مجموعہ ہے۔ جو ۱۹۳۲ء میں شائع ہوا تھا۔ اس میں بعد کے چند عمدہ افسانوں کا انتخاب درج کیا گیا ہے۔

۳۔ نیرنگ۔ (زیر طبع) ایک ناول ہے۔

۴۔ طلسمات۔ ۔ ۔ ۔ ۔ آپ کے جدید پندرہ افسانوں کا مجموعہ ہے۔

۵۔ داستان۔ دنیا کی سب سے رنگین کتاب افروڈائٹ کا کامیاب ترجمہ ہے

انتخابِ کلام

کمالِ صبر و ضبط ہے یہ میری دُو دہست ہے
دیارِ عاشقی میں حوصلوں کی راہ پست ہے

سُنی ہے میں نے بات یہ کسی شراب خوار سے
خوشا وہ بندۂ جنوں جو کیفِ غم سے مست ہے

نظر ہے کامگارِ حُسن یار پھر بھی خوش نہیں
یہ بندوبستِ عشق ہے کہ فتح کو شکست ہے

شباب کا لحاظ بھی ہے دل کی احتیاط بھی
خیال پاکباز ہے نظر صنم پرست ہے

یہ عابدِ وفا پرست کی صدائے عشق ہے
یہ موجۂ بہار ہے کہ نغمۂ الست ہے

عجب نہیں جو محبت مری سرشت میں ہے
یہی شرارِ نہاں روحِ سنگ و خشت میں ہے

ابھی نگاہ پہ ہیں رسم و وہم کے پردے
ابھی نگاہ طلسماتِ خوب و زشت میں ہے

یہ رنگ و نور کے جلوے، یہ دلکشا نغمے
صنم کدے ہیں کہ ذوقِ نظر بہشت میں ہے

نہ بجلیوں کو خبر ہے نہ خوشہ چیں کو پتہ
کہ اک نہالِ محبت ہماری کشت میں ہے

یہ ساکنانِ حرم سے پتہ چلا عابدؔ
کہ ڈھونڈھنے جسے نکلے ہو وُہ کنشت میں ہے

غمہائے انتظار کا شکوا نہ کیجئے
الفت کے اعتبار کو رسوا نہ کیجئے

تذلیلِ آرزو پہ بہت خوش نہ ہو جیئے
پامالئ وفا کو گوارا نہ کیجئے

اِس ظاہری سکوں کو حقیقت نہ جانیئے
اندازۂ وفورِ تمنا نہ کیجئے

تدبیر ترکِ عشق، دوائے جنونِ غم
دل پر ہو اختیار تو کیا کیا نہ کیجئے

عشرتِ حُسن کو ثبات نہیں
ہاں نہیں اور کوئی بات نہیں

ہائے وہ نغمہ زیرِ بربطِ عشق
جس میں اب لرزشِ حیات نہیں

ہنس رہا ہے فلک پہ ماہِ جبیں
چاندنی کی پری ہے رات نہیں

یوں تو میٹھی زباں ہے ظالم کی
آنکھ میں رنگِ التفات نہیں

عشق سے شش جہت میں رنگِ فروغ　　حُسن سے جوشِ کائنات نہیں
میکشی، عاشقی، پرستشِ حُسن
میرے کچھ اور واقعات نہیں

بے حسی بری شئے ہے دلکو مضطرب کرلوں　　یا وفورِ عشرت سے یا غمِ تمنا سے
آگئیں وہ پہلو میں با فروغِ رعنائی　　چاندنی اُتر آئی رفعتِ ثریا سے

دلِ آگاہ عابدؔ میرے مرنے کی نشانی ہے　　جسے نیرنگِ ہستی میں جنونِ راز دانی ہے

ابھی کچھ سیر باقی ہے سرابِ کامرانی کی　　ابھی انکے تغافل پر گمانِ مہربانی ہے

نیازِ عشق ان کی مہربانی پر نہ اترائے　　کہ اُن کے حُسنِ بے پروا کو خوئے سرگرانی ہے
زباں کھولے تو مجبورِ جنونِ عشق کہلائے　　دلِ مایوس اچھا ہے کہ محوِ بے زبانی ہے
یونہی سینے میں میرے آگ سی اک لگ اُٹھی عابدؔ
بلائے عشق میں شانِ بلائے ناگہانی ہے
یہاں میں مضطرب ہوں کاہشِ اندوہِ فرقت سے　　وہاں نغمے نکلتے ہیں کسی کی بزمِ عشرت سے

یہاں سوزِ دروں سے میرے دل کا خون ہوتا ہے
وہاں دستِ نگاریں سرخ ہیں مہندی کی رنگت سے

یہاں سینے میں میرے سانس بھی رُک رُک کے آتا ہے
وہاں آنا انہیں مشکل ہوا فرطِ نزاکت سے

یہاں پھولوں کو میں اپنے کلیجے سے لگاتا ہوں
وہاں رنگیں ہے محفل گیسوئے مشکیں کی نکہت سے

یہاں مجھ کو خمارِ عشق نے برباد کر ڈالا
وہاں ظاہر ہے مستی نرگسِ میگوں کی حالت سے

یہاں اک شمع کو میرا سیہ خانہ ترستا ہے
وہاں مہتاب بھی اک داغ ہے جوشِ لطافت سے

شاعر

ابھی سر د تھا انجمستانِ فطرت
ابھی داغ تھے زیبِ دامانِ فطرت

خیاباں نما تھا بیابانِ فطرت
خزاں آشنا تھا گلستانِ فطرت

ابھی آفرینش کا دن اولیں تھا
ابھی ماہ یوں راہ پیما نہیں تھا

نہ تھے جلوہ گر آسماں پر ستارے
نہ تھے مہرِ گردوں کے روشن شرارے

نہ تھے یوں رواں موجِ تابش کے دھارے
نہاں تھے یہ سب حُسن کے ماہ پارے

ابھی کہکشاں جلوہ گستر نہیں تھی
ازل میں تو ہو گی فلک پر نہیں تھی

صدف تھا مگر اس میں گوہر نہیں تھا — گلوں کے لئے کیسۂ زر نہیں تھا
دلِ عشق تھا اور مضطر نہیں تھا — محبت کا جوہر بلبستر نہیں تھا

فضائیں ترنم سے نا آشنا تھیں
ہوائیں تبسم سے نا آشنا تھیں

سیاہی میں شب کی لطافت نہیں تھی — چمکنے کی بجلی کو عادت نہیں تھی
غمِ عاشقی کی مصیبت نہیں تھی — مصیبت میں پنہاں مسرت نہیں تھی

سکوں پروردۂ دارِ جنوں تھا ابھی تک
نہاں آنکھ سے اشکِ خوں تھا ابھی تک

کہ فطرت نے اجزائے عالم پہ چھڑکا — وہ پانی کہ اکسیر ہے نام جس کا
تپش ہوگئی روحِ قدرت میں پیدا — ہر اک شئے سے ذوقِ نظر پھوٹ نکلا

محبت در آغوش آیا ہے شاعر
مئے غم سے مدہوش آیا ہے شاعر

تموّج ہوا آبشاروں میں پیدا — ہوئیں مستیاں گلعذاروں میں پیدا

ہُوا کون یہ غم کے ماروں میں پیدا لطافت ہوئی لالہ زاروں میں پیدا

کہ ہنسنے لگی خوش جمالوں کی دُنیا

مہکنے لگی حُسن والوں کی دُنیا

گلِ حسنِ فطرت کی تصویر شاعر کتابِ محبت کی تفسیر شاعر

ہر اک خوابِ عشرت کی تعبیر شاعر ضیائے لطافت کی تنویر شاعر

شرابِ تخیل سے مخمور ہے وُہ

مصیبت میں ہے اور مسرور ہے وُہ

اُٹھائے وہ بارِ غمِ آفرینش ہوا حکم جاری دمِ آفرینش

دلِ مضطرب میں سمِ آفرینش نگاہوں میں اُس کی تمِ آفرینش

وفا کے فسانوں پہ خوں رونے والا

محبت کی آغوش میں سونے والا

رُباعیات

تنویر سے ہو رہی ہے تعمیر بہار نقاش ازل ہے محوِ تصویرِ بہار

تاروں کی طرح چمک رہی ہے دنیا　　تفسیر ہے رنگ و بو کی تعبیرِ بہار

وارفتۂ عہدِ جوانی ہوں میں　　تصویرِ بہارِ شادمانی ہوں میں
دُنیا کا ہے آب و رنگ مجھ سے قائم　　یہ کس نے کہا کہ نقشِ فانی ہوں میں

ایسا نہ ہو عشق دل کو رنجور کر دے　　برباد مجھے شعلۂ مستور کر دے
دے جام شرابِ آتشیں اے ساقی　　ممکن ہے کہ زہر زہر کو دُور کر دے

اندوہِ محبت کی فراوانی ہے　　محفل مری تصویرِ پریشانی ہے
دے زہر سے بھر کے ایک جام اے ساقی　　یہ بادۂ تلخ تو مجھے پانی ہے

تنویرِ وفا ہے زندگانی میری　　تصویرِ ضیا ہے شادمانی میری
رقصاں ہیں نگاہِیں تصاویرِ جمال　　فانوسِ خیال ہے جوانی میری

"باز ایں چہ آفت است نہالِ امید را
امسال ہم شگوفہ فشاند و ثمر نشد"

نہیں بھولتا اُن کی رخصت کا وقت
وہ رو رو کے ملنا بلا ہو گیا (حالی)

دلِ بیقرار و غمِ ناگہاں — پلا ساقیا بادۂ ارغواں
سکوں کوئی حاصل نہ یوں ہو مجھے — تو دے زہر میں گھول کر خوں مجھے
مغنی اِسن اے فتنۂ عقل و ہوش — لہو سے ہوا دل کفِ گلفروش
کوئی چیز اے ماہ پارا بجا — سریلی دھنوں میں کدارا بجا
مغنی وُہ عالم مجھے یاد ہے — جُدائی کا ماتم مجھے یاد ہے
سرِ شام وُہ اُن کا جانا ہے یاد — مجھے آجتک وُہ فسانہ ہے یاد

گئیں اور ذوقِ فغاں دے گئیں — نشانِ غم بے نشاں دے گئیں
گئیں اور پابندِ غم کر گئیں — یکایک نگاہوں سے رم کر گئیں
مرے دل کی شادابیاں لے گئیں — وہ ساتھ اپنے دونو جہاں لے گئیں
رگوں میں ٹھٹھر سی گئی موجِ خوں — خزاں ہو گیا لالہ زارِ جنوں

کلی شادمانی کی مرجھا گئی — خدا جانے کس کی نظر کھا گئی
مغنی ذرا چھیڑ دے بانسری — سنا دے کوئی راگنی مدھ بھری

مغنی ذرا اپنا بربط سنبھال — فسانے محبت کے دوزخ میں ڈال
محبت نے دل میرا خوں کر دیا — محبت نے محوِ جنوں کر دیا
سنا کوئی تازہ غزل شعلہ کار — کہ نکلے کسی طرح دل کا بخار

کیا خنجرِ غم نے دل چاک چاک — پلا ساقیا بادۂ تابناک
نہ کر عشق میں فکرِ سود و زیاں — نہ ہو کاوشِ این و آں سے ہلاک
نہ دنیا کی پروا نہ عقبیٰ کا خوف — نہ جنت کی خواہش نہ دوزخ سے باک
خدیوِ زمین و زماں ہے یہ دل — محبت سے روشن ہے یہ مشتِ خاک
نہ وہ بادہ کش ہیں نہ وہ پارسا — نہ وہ اہرمن ہے نہ یزدانِ پاک

مرے خوں سے عابدؔ ہے شانِ بہار
مرے خوں سے رنگیں ہیں رگہائے تاک

شامِ نشاط

بہارِ نشاط و فروغِ شباب — پلا ساقیا بادۂ برق تاب

فضا نغمہ زار و ہوا مشکبار — اٹھا ساقیا ساغرِ زرنگار

پلا ساقیا بادۂ لعل فام — کہ رنگیں ہوئی تیرے جلووں سے شام

سُن اے مطربِ نغمہ پرداز سُن — کوئی نغمہ ظالم طربناک چُن

نہیں جوگ سے کوئی مجھ کو مذاق — کہ طے ہو چکی ہے بساطِ فراق

زہے وصل کی شب زہے انبساط — کہ معمورِ عشرت ہے دل کی رباط

یہ حالت ہے گھر کی سرِ شام سے — کہ طلعت رواں ہے در و بام سے

* بچھا ساقیا آج پھولوں کا فرش — کہ شرمائے اپنے ستاروں پہ عرش *

میسر ہے سامانِ بزمِ سرود — دف و بربط و مزمر و چنگ و عود

اُٹھ اے ساقیِ دلربا رقص کر — اُٹھ اے مطربِ خوشنوا رقص کر

ہوئی آج مشکل محبت کی حل — سنا دے کوئی روح پرور غزل

اُٹھائیں اگر آپ منہ سے نقاب — تو پھیکا پڑے چہرۂ آفتاب

بہت آستانوں پہ سجدے کئے — بُہت کر دیا میں نے رسوا شباب
نہ کر ان سے ملنے کی اے دل ہوس — کہاں خس کہاں شعلۂ برق تاب
وہ بہکی ہوئی چال بیباک دست — وُہ مہکے ہوئے گیسوئے مشک ناب
اُنہیں جب سے دیکھا ہے عابد نے یوں — نہ آرام دن کو نہ ہے شب کو خواب

چمن زارِ دل میں بہارِ آگئی — بہار آگئی آشکار آگئی
دھڑکنے لگا سینۂ کائنات — ہوئی تیز رفتارِ نبضِ حیات
یکایک فضا گل بداماں ہوئی — یکایک تجلی نمایاں ہوئی
بدلنے لگا انتظامِ جہاں — کہ سورج ہوا ارات کو ضو فشاں
وُہ آئے جلو میں لئے نور کو — خبر دے کوئی جلوہ طور کو

ہوا اُن سے پھر آمنا سامنا
مجھے ہم نشیں تھا منا تھا منا

ہوئی خاکساری مری سر فراز — ہوا نازِ اُن کا اسیرِ نیاز
محبت کے نالے رسا ہو گئے — دریچے سعادت کے وا ہو گئے

نہ وہ بے قراری نہ دردِ جنوں — جنوں ہو گیا سایہ دارِ سکوں

الٰہی ترا شکر ہے لاکھ لاکھ — کہ رکھ لی ہے ناچیز بندے کی ساکھ

تمنا کی نورس کلی کھِل گئی

ترے فیض سے زندگی مل گئی

خضرؔ

(ــــــــــــ ۱۹۰۰ء)

میاں مولابخشؒ صاحب خضرؔ یکم جنوری ۱۹۰۰ء کو چنیوٹ ضلع جھنگ میں پیدا ہوئے۔ آپ چنیوٹ کے خاندانِ قصاباں کے نہائت معزز رکن ہیں۔ اکثر کہا کرتے ہیں ع

رونقِ دودمانِ قصابیم

اپنے ماحول میں کافی عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ چنانچہ ایک دفعہ مجھ سے عدیم الفرصتی کی توجیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں "میں آج کل حد درجہ مصروف ہوں اسکی وجہ یہ ہے کہ ہمارے شہر میں انتخاباتِ بلدیہ کی طیاریاں بڑے زوروں پر ہیں۔ بدقسمتی سے جملہ قصابان کرام کی طرف سے واحد نمائندہ ہونیکی فال بنام من دیوانہ زدہ اند"

آپ نے ابتدائی تعلیم چنیوٹ میں پائی۔ ایف۔ اے گورنمنٹ کالج لائلپور

سے اور بی۔اے (آنرز) اسلامیہ کالج لاہور سے پاس کیا۔ ۱۹۳۶ء میں خانگی طور پر ایم۔اے (فارسی) کا امتحان پاس کیا۔ لا کالج میں کچھ عرصہ تک تفریحاً پڑھتے رہے۔ تفریحاً اس لئے کیونکہ اس عرصہ میں بیشتر وقت طبلہ بجانے میں صرف کرتے تھے تاہم آپ نے ایل۔ایل۔بی کا امتحان پاس کر لیا۔ اب چنیوٹ میں وکالت کرتے ہیں۔ اور کامیاب وکیلوں میں شمار ہوتے ہیں خضرؔ کی طبیعت میں بذلہ گوئی اور حاضر جوابی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے اس لئے احباب کی مجالس میں مغتنمات میں شمار ہوتے ہیں۔ یہی جوہر آپ کی نظم و نثر میں کارفرما ہے۔ اپنی تاریخ پیدائش بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں "تاریخ پیدائش (دروغ برگردنِ راوی) یکم جنوری ۱۹۰۶ء ہے (ہماری پیدائش کے اعزاز و احترام میں اس روز مسیحی اور پارسی دنیا میں تعطیل منائی جاتی ہے)" اپنی زندگی کا نہائت اہم واقعہ اس طرح بیان کیا ہے "حالاتِ زندگی میں البتہ یہ بات قابلِ یادگار ضرور ہے کہ میرے جیسا محقق، (حقہ پینے والا) ۲۲ر دسمبر ۱۹۳۳ء سے یکدم حقہ نوشی سے تائب ہو گیا ہے"

نظم اور غزل بھی لکھتے ہیں لیکن آپ کا میلان مناظرہ نویسی کی طرف زیادہ ہے چنانچہ چند ایک نہائت اچھے مناظرے لکھے ہیں۔ ان مناظروں کی تمہید

نہایت دلچسپ ہوتی ہے۔ اور قوتِ مشاہدہ کے شاہکار کی حیثیت رکھتی ہے۔ تمہید کے بعد جانبین سے دلائل نہایت دیانتداری سے فراہم کئے جاتے ہیں۔ اور آخر میں بالعموم مشرق کے حق میں نہایت جچا تلا منصفانہ فیصلہ کیا جاتا ہے۔

خضر صرف شاعر ہی نہیں۔ بلکہ جملہ فنونِ لطیفہ سے دلچسپی لیتے ہیں۔ چنانچہ طبلہ بجانے میں آپ کو مہارت تامہ حاصل ہے۔ آج کل کشمکشِ روزگار میں اس شغل کو فرصت پر ملتوی کئے ہوئے ہیں لیکن اس کے باوجود جنونِ شوق رونمائی سے باز نہیں رہتا۔

انتخاب کلام

حُقّہ اور سگرٹ کا مناظرہ

ابھی کل شب میں فکرِ خواب میں تھا | کہ آنکھوں نے عجب دیکھا تماشا
پڑے تھے انس و جاں مدہوشیوں میں | عجب اِک خوف تھا خاموشیوں میں
مَیں سونے کے لئے بس تُل رہا تھا | ابھی حُقّے کو پی پی کر اُٹھا تھا
نہ اوڑھی تھی ابھی میں نے رضائی | کہ ڈبیا سگرٹوں کی کسمسائی

لگی کہنے کہ سن حقّہ برادر! — مرے ماں باپ ہوں قربان تم پر

مرے بیٹے میاں سگرٹ کو تم سے — سنا میں نے کہیں چند ایک شکوے

نہیں میں چاہتی تم میں لڑائی — کہ وُہ بیٹا مرا اور تو ہے بھائی

یہ کہکر اُس نے سگرٹ کو بلایا — زراہِ امتثالِ امر آیا!

لگا کہنے وہ حقّے سے کہ ماموں — مجھے بخشا ہے اللہ نے وُہ افسوں

کہ ہوں اِس دَور میں تہذیب کے میں — نشستہ ہر کس و ناکس کے منہ میں

کوئی ہندی کہ ایرانی فرنگی — نیا تثلیث کا فرزند بھنگی

سبھی نے رشتۂ الفت مجھی سے — ہے جوڑا دیکھنا کیسی خوشی سے

سر و بنیت باہم ناموافق — بقربان سر گورِ منافق

تناسب دیکھنا اعضا کا میرے — دھواں میرا ہے جُوں نازک پھریرے

ہوا میں صورتِ گیسو پریشاں — مرے عشاق کو ہے راحتِ جاں

تمباکو کا کوئی عادی اگر ہو — مگر دل میں کہیں خوفِ پدر ہو

تو اُسکی آرزو چپکے سے پوری — کیا کرتا ہوں وقتِ ناصبوری

نہیں چلنی تری مانند کھاتا — نہیں ہنگام دم میں گڑگڑاتا

نہ پانی پیٹ بھر پینے کی حاجت — نہ سر پر آگ رکھنے کی ضرورت

مجھے تم دُور سے آتش دکھاؤ — مزے سے بیٹھ کر پھر کش اڑاؤ
میسّر ہے مجھے صاحب کی صحبت — عیاں ہے مجھ پہ قدر و قیمتِ وقت
جو دیتا کام ہے مکتب میں ڈنڈا — وہی دیتا ہے گاڑی میں آئیندہ
ہوں یونیورسٹی کے نور دیدہ — نتنّے کے ٹوٹنے سے گرکبیدہ
ادا کرتا ہوں میں حقِ رفاقت — کیا کرتا ہوں ٹھیک اُنکی طبیعت
اجی اب بوریا بدھنا سمیٹو — یہاں سے بسترِ اقدس لپیٹو
تمہاری ہو چکی بگلے سی ڈاڑھی — ہوس رہنے کی ہے یاں پھر بھی باقی
گذشت آں دورِ جد و جہدِ مجنوں — برو کیں نو بۂ مایاں ست اکنوں
نہ جانے سگرٹوں نے بے محابا — دفورِ بے خودی میں کہہ دیا کیا

جو دیکھی حضرتِ حقہ نے یہ بات، — کہ بروے نے دکھائے اور ہی پات
بزرگانہ ادا سے مُسکرایا — عجب دلکش صدا سے گڑگڑایا
لگا سگرٹ سے یوں کہنے کہ منّے — ذرا دیکھو تو منہ میں دانت ہیں کے
تجھے ہے پھونکنا جس نے سکھایا — اُسی کو تو نے وائے کاٹ کھایا
ترا مجھ سے تقابل بھی ہے یونہی — کہ جیسے ہوسٹل اور گھر کی روٹی

بھلا تجھ کو ہے مجھ سے واسطہ کیا — غبارِ رہ کو منزل کا پتہ کیا

خجالت کش ہوئی مینا کی قلقل — مِری حق حق کے آگے صورتِ گل

ملی ادراک کو پرواز مجھ سے — ملا محفل کو سوز و ساز مجھ سے!

تجھے ہے کرمکِ شب تاب رہنا — مجھے مہتاب بن کر ہے چمکنا

بھرا ہیں سُرخ انگاروں کا چولہا — تو میرے سامنے تنہا شرارہ

تمہیں کو ہو مبارک یہ خموشی — کسی کے ہاتھ میں غیرت فروشی

نہیں یہ زندگی مستور رہنا — بھلا اِس سے تو ہے مخمور رہنا

بلا شور و شغب کے زندگی کیا — نجومِ آسا تری تابندگی کیا

نہیں تو محفل آرائی کے قابل — نہیں بلکہ خود آرائی کے قابل

وہ گردش گردشِ ایّام کے ساتھ — وہ کاوش کاوشِ انجام کے ساتھ

مِری قسمت میں ہے جلنا جلانا — الگ دُنیا سے تجھ کو سر کھپانا

نرالی چیز ہے میرا سراپا — تجھے اِن نعمتوں سے واسطہ کیا

مِری ٹوپی بسانِ تاجِ زریں — فروزاں ہے مثالِ ماہ و پرویں

گلے میں ہار میرے یہ نہیں ہیں — ہجومِ خلق کے تارِ نگہ ہیں

مرے سیمیں بدن پر ہیں لپیٹے | کسی کی زلف کی مانند دھاگے
کسی نے دیکھ کر جن کو کہا تھا | وفورِ بے خودی میں کہ اُٹھا تھا
سیہ چوری بدستِ این نگارے | بشاخِ صندلیں پیچیدہ مارے
مجھے بھی حق نے بخشا ہے وہ افسوں | کبھی ہیں گڑگڑی گہ پیچواں ہوں
کبھی سب مجھ کو کہتے ہیں چموڑا | پیو جتنا بھی حقہ سو ہے تھوڑا
کہا کیا؟ جو نہیں خوفِ پدر سے | کبھی تمبا کو پیتے اُن کو تم سے
مراسم ہیں پرانے جان پہچان | قدیمی ہے اگر تو اے مری جان
بھلا تم [illegible] بُوں مجرم سے پیچ پر | مری مانند ہوتے کاش سچ پر
مجھے اُن بزدلوں سے واسطہ کیا | تم اُنکے ہو تمہارا پوچھنا کیا
اگر تم کو میسر ہیں وہ صاحب | تو کافی ہیں مجھے بھی شیخ صاحب
ہوئے کالج کے لونڈے میت کسکے | تجھے پی کر دیا پھینک اور کھسکے
بزرگوں سے یہاں اب دل لگاؤ | مراسم ظاہری پر تم نہ جاؤ
کہا مجھ کو کہ اب بستر لپیٹو | یہاں سے بوریا بدھنا سمیٹو
بڑی بات اور چھوٹا منہ کیا خوب | تمہیں کسقدر خودرائی ہے مرغوب
نہیں کہنا تھا یہ فقرہ تو میں نے | مگر دہرا دیا ہے مجھ پہ تم نے

سُنو گر جانِ بابا کچھ روایات | تمھیں معلوم ہو میری بھی اوقات
چلا آتا ہوں نسلاً بعد نسلٍ! | تمہاری زندگی ہے بلکہ اِک دن
جو دیکھا میں نے سگرٹ بجھ گیا تھا | زمیں پر راکھ سا نیچے پڑا تھا
مگر ویسے ہی حُقہ گڑگڑاتا! | دعائے فاتحہ واں پڑھ رہا تھا

مناظرہ سارنگی و طبلہ

دُنیا بھر کے بے فکروں نے کل بزمِ سرود سجائی تھی
کیا دل کو مسلتا تھا طبلہ۔ کیا سارنگی رنگ لائی تھی
بسمل کی رگِ جاں بنتی تھیں طاؤس کی تاریں لرزش سے
چائے کا پیالہ دور میں تھا حقے نے دھوم مچائی تھی
رندوں نے جھنڈے گاڑے تھے زہاد نے ڈیرے ڈالے تھے
اس دیر و حرم کی محفل میں موسیقی گانے آئی تھی
یاں شکوے سے پُر سارنگی واں پیچ و تاب میں تھا طبلہ
گز بھر کی زباں یاں چلتی تھی واں ہاتھو نکی بن آئی تھی

واں تھاپ کے ابر گرجتے تھے نغموں کی پھہاریں پڑتی تھیں
یاں ہر دل پر موسیقی کے کہرے نے قنات لگائی تھی

اڑتی تھیں فضا بھر میں تانیں، تھی چال صبا کی مستانہ
اس حال میں بیچ میں دونوں کے جا بیٹھا شاعر مستانہ

سارنگی بولی طبلے سے تم یونہی شور مچاتے ہو
اے منہ پھٹ طبلے دیوانے کیوں کان ہمارے کھاتے ہو

آواز تمہاری کوے سی اور شکل چھلاوے سی تیری
ان میٹھی میٹھی تانوں کے تم رنگ میں بھنگ ملاتے ہو

لعنت ہے تمہارے جینے پر آرام نہیں عزت بھی نہیں
میں گودوں میں جا بیٹھتی ہوں تم سر اپنا پٹواتے ہو

ہے خام ابھی تک عشق ترا کچھ صبر نہیں کچھ تاب نہیں
یاں تان اڑی اک میٹھی سی واں تھام کے دل رہ جاتے ہو

میں راج دلاری البیلی ناری ہوں پریم کنہیا ہوں
تم مونڈی کاٹے مردک ہو ہر جا پر دھکے کھاتے ہو

تہذیب تمہیں منظور نہیں اور عقل ترا دستور نہیں
تم بھیم کی تانوں میں باہر کیوں آپے سے ہو جاتے ہو
نازوں سے پلی شہزادی ہوں میں ناری محلوں والی ہوں
تم حبس دوام کے قیدی ہو صندوقوں میں ڈٹ جاتے ہو
جب سارنگی نے طبلے سے یوں دل شکنی کا کلام کیا
کچھ دیر تو وہ خاموش رہا پھر بھابی جاں کو سلام کیا

یوں کہنے لگا سارنگی سے جلتی پر تیل گراتی ہو
ہم رنج و الم کے مارے ہیں تم آکر اور ستاتی ہو
عشاق سے یوں منہ پھیرا کیوں پھر تو نے ہمیں آگھیرا کیوں
رہنے دو اسے چپ مجبور اً کیوں میری زباں کھلواتی ہو
میں زنجیبار کا شہزادہ۔ میدان میں آکر ضیغم سا
جب ایک دہاڑ لگاتا ہوں تم پردوں میں ڈر جاتی ہو
پیمانِ وفا جس سے باندھوں میں پاس اسی کے رہتا ہوں
تم ہر جائی ہو ہر اک کے پہلو میں دل بہلاتی ہو

کچھ لطف ہے سینہ کوبی میں سر پھوڑتے ہیں ہم مستوں کو

بی! یہ تو عشق کے زیور ہیں۔ تم یونہی ہمیں بناتی ہو

عزت پہ ہماری حرف زنی؟ اللہ غنی! اللہ غنی

وہ وقت بڑی بی بھول گئیں جب کان اپنے کھنچواتی ہو

تو پریم کنہیا محفل میں کس بے باکی سے گاتی ہے

گو یوں تم بھولی بھالی ہو کچھ کہتے بھی شرماتی ہو

میں تیری شمیمِ نغمہ کو مانند نسیم اڑاتا ہوں

یہ میری تھاپ کی برکت ہے دل بزم میں مسلے جاتی ہو

جب لڑکے مل کر گاتے ہیں عرفاں کی تانیں اڑاتے ہیں

ہاتھوں سے بین بجاتے ہیں تم یاد کب ان کو آتی ہو

میں آذرِ عشق کی تابش سے دل محفل کے گرماتا ہوں

طاؤس کو طنبورے کو تجھے دن میں تارے دکھلاتا ہوں

یہ سنکر شمس الدین ڈرے تلوار مبادا چل جائے

اور طبلہ سسکتا رہ جائے سارنگی روتی رہ جائے

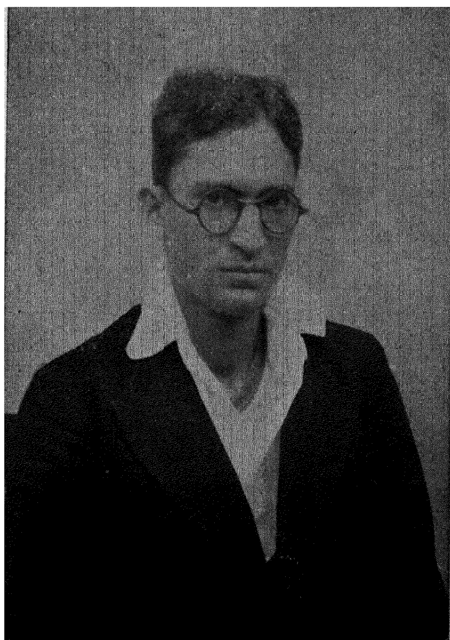
چمکارے سارنگی سے تم سیدھی سادھی بھولی ہو
زیبا نہیں گر یوں مُنہ میں ترے گنوارنکی سی بولی ہو

طبلے کے وکیلِ مطلق نے واں ہاتھ سے اس کو سمجھایا
اچھا نہیں خوں کی نہروں سے گر محفل بھر میں ہولی ہو

تم زنجیبار کے شہزادے۔ سارنگی سارنگی ٹھہری
پھبتی نہیں گر شہزادوں کی ایسی بولی ٹھولی ہو

خاموش ہوئیں بی سارنگی اور طبلہ صُمٌّ بُکمٌ تھا
یوں جیسے کسی نے زباں اپنی کوثر کے آب میں دھولی ہو

القصہ بچھڑے دوست ملے نہ جھگڑا تھا نہ شکوہ تھا
نے تن تنا تن تن تن تن تن تھی نے تاکڑتا کڑدھیا تھا



حمید عرفانی

حمید عرفانی

(سنہ ۱۹۰۹ء ——)

خواجہ عبدالحمید صاحب حمید عرفانی سنہ ۱۹۰۹ء میں منگلا لوالی ضلع سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ چونکہ آپ کی فطرت میں لاابالیانہ پن بدرجۂ غائت ودیعت ہوا ہے۔ اس لئے آپ کوشش کرنے پر بھی اپنی تاریخ پیدائش نہیں بتا سکے۔

ابتدائی تعلیم چکوال میں ہوئی۔ صادق ایجرٹن کالج بہاولپور سے سنہ ۱۹۲۷ء میں ایف اے اور پرنس آف ویلز کالج جموں سے سنہ ۱۹۲۹ء میں بی۔ اے امتیازی حیثیت سے پاس کیا۔ بعد میں کچھ عرصہ تک لاہور رہے۔ اور پھر گورنمنٹ ہائی اسکول کوئٹہ میں ملازم ہو کر چلے گئے۔ چنانچہ اب تک وہیں مقیم ہیں۔ دورانِ ملازمت میں آپ نے سنہ ۱۹۳۳ء میں پنجاب یونیورسٹی سے ایم۔ اے (فارسی) امتیازی حیثیت سے پاس کیا۔

عرفانی کی شاعری کی ابتدا بچپن کے زمانہ سے ہوئی۔ اس وقت اقبال

کے مطالعہ کا شوق تھا۔ اسلئے ابتدائی نظموں میں اقبال کا رنگ غالب ہے۔
بعد میں نظیری اور حافظ سے اسقدر متاثر ہوئے۔ کہ فارسی میں شعر کہنے لگے۔ ابتدائی
نظمیں 'ہزار داستان' مرحوم میں شائع ہوئیں۔ فارسی کی چند غزلیں 'معارف' میں شائع
ہوئیں۔ اور علامہ سید سلیمان ندوی نے کافی ہمت افزائی کی۔ لیکن عرفانی اپنی عادت
سے مجبور ہیں۔ پہلے تو کہتے بہت کم ہیں۔ اور اسکے بعد اپنے کلام کو اشاعت کے لئے
بھیجنا اُن کے نزدیک جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔ اس لئے اخباری شہرت سے
تا ہنوز محروم ہیں۔

آپ نہایت مخلص اور نیک نفس انسان ہیں۔ لیکن فطرت نے استغنا
طبیعت میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہے۔ اسلئے اُن کی کوشش کے باوجود اُن کے
احباب اُنکے خلوص سے متمتع نہیں ہو سکتے۔ چونکہ وہ خود اپنی ہر ایک مصیبت
کے متعلق۔ ع

یک جہان و آں ہم از خونِ تمنا ساختن

کہہ کر خاموش ہو جاتے ہیں۔ اسلئے دوسروں سے بھی اس کی توقع رکھتے ہیں۔ تعجب
انگیز امر یہ ہے۔ کہ وہ (ماسوا محبت کے) ہر ایک دنیاوی دلچسپی سے اس قدر
بے نیاز ہونے کے باوجود ٹینس کے نہائت اچھے کھلاڑی ہیں۔ چنانچہ کئی سال

تک متواتر بلوچستان کے جُملہ میچ نہایت کامیابی سے کھیل چکے ہیں۔ اور کئی کپ (Cups) اور تمغے حاصل کر چکے ہیں لیکن اب کھیل سے جی بھرتا جا رہا ہے کہا کرتے ہیں "میں پیدا شاعر ہوُا تھا۔ لیکن حالات کی ستم ظریفی دیکھئے۔ کہ مجھے کھلاڑی بننے پر مجبور کر دیا گیا ہے"!

انتخابِ کلام

نمودِ حُسن کیا ہے اور نگاہِ پُرفسوں کیا ہے؟ — کسے معلوم ہے فرزانگی کیا ہے جنوں کیا ہے
تلاشِ راحتِ جاوید ہے وجہِ سکوں مجھ کو! — خدا جانے تمنائے سکوں کیا ہے سکوں کیا ہے!
سرابِ آرزو سے ہے فریبِ زندگی لیکن — فریبِ زندگی میں کاوشِ دردِ دروں کیا ہے

مدعا اِس شباب کا کیا ہے — کیا خبر دل کو ہو گیا کیا ہے
ڈال دے ڈال دے سفینۂ عمر — رُخ ہواؤں کا دیکھتا کیا ہے
کٹ مریں کارزارِ ہستی میں — اور جینے کا مدعا کیا ہے
کشتِ زارِ حیات کا حاصل — حسرتوں کے سوا بھلا کیا ہے

اِک فریب نظر پہ مٹ جائیں — دردِ ہستی کی اور دوا کیا ہے
کاٹنا دن شباب کے جی کر — آہ فرہاد نے کیا کیا ہے
ایک دل تھا سو مٹ گیا آخر — اپنی دُنیا میں اب رہا کیا ہے
زندگانی تجھے خدا سمجھے — کون سمجھے مگر خدا کیا ہے

عہدِ رفتہ کہاں ہے عرؔفانی
لوٹ کر دیکھتا بھلا کیا ہے

ساقی نویدِ رونقِ فصلِ بہار کیا — ناحق نمک چھڑکنا ہے زخموں پہ یار کیا
اپنے تصورات کی دنیا وہی رہی — پھر انقلابِ گردشِ لیل و نہار کیا
مدت سے اپنے آپکی مجھ کو خبر نہیں — اے عشق بنگیا مرا مشتِ غبار کیا
افسردہ ہوگئی ہیں امنگیں شباب کی — اب اے دلِ حزیں ہے تجھے انتظار کیا
داد اُن سے چاہتا ہوں دلِ بیقرار کی — جن کو خبر نہیں ہے دل بیقرار کیا

اپنے جنونِ شوق نے رسوا کیا حمیدؔ
اب ہم کریں کسی پہ بھلا اعتبار کیا

میں اور تم

مرے جہانِ محبت کو خواب کہتے ہو؟ — مگر بتاؤ تو پھر اصل زندگی کیا ہے
مرے سرورِ نظر کو حجاب کہتے ہو — مگر کھلا نہ یہ تم پر کہ روشنی کیا ہے

تمہاری زیست ہے کیا انتظار کرنے کا؟ — ترس رہے ہو تم اک خوابِ جاوداں کیلئے
مرا جہاں مری رنگینیوں سے ہے پیدا — تمہاری بود ہے اوہامِ ناگہاں کیلئے

مرا مقام ثواب و گناہ سے ہے بلند — تم اور تمہاری نشیب و فراز کی دُنیا
ہے میری دید کو اصلِ نگاہ سے پیوند — ہے مجھ کو وجہ حقیقت مجاز کی دُنیا

مجھے یقیں ہے بہر حال زندگانی میں — مگر تمہیں تو کسی بات پر یقیں ہی نہیں
مرے لئے تو مزا ہے اسی کہانی میں — مرے جنوں کو تمیزِ چناں چنیں ہی نہیں

مری حیات میں رنگِ شباب رہنے دو
فریبِ حسن سے کچھ بار یاب رہنے دو

بہار

پھر بہار آئی ہوا تازہ فسونِ کائنات
ذرہ ذرہ ہے قتیلِ ذوقِ تجدیدِ حیات

آسماں سے پھر نزولِ بارشِ انوار ہے
پھر زمانہ ایک نغمہ ریز لالہ زار ہے

رقص کرتے ہیں فرشتے بر فرازِ کوہسار
پھر ہوا ہے حسن عالم سوز ہم رنگِ بہار

پھر ہوئے پیدا ستارے کرمکِ شب تاب کے
پھر نئے نغمے کرشمے دیکھئے مضراب کے

پھر ہوئی رقصاں رگوں میں موجِ خونِ زندگی
چھا گئی ہے پھر فضا پر تازگی ہی تازگی

پھر جنونِ شوق سے جیبِ گریباں تا زنار
رستخیزِ عالمِ جذبات ہے رنگِ بہار

اٹھ رہے ہیں ولولے نومیدیٔ جاوید سے
مرتعش ہے دل کسی موہوم سی امید سے

پھر کسی کی مسکراہٹ دل کو بہلانے لگی
پھر مری تاریکیوں میں روشنی آنے لگی

آتشِ تخئیل میرے قلب کو گرما گئی
اور مری افسردگی کشمیر بن کر چھا گئی

پھر ہوئی ہیں لرزشیں پیدا شکستہ ساز سے
نغمہ ہائے درد جاگ اٹھے مری آواز سے

پھر وہی بے تابیاں عہدِ کہن کی یادگار
پھر وہی بے اختیاری ہائے قلبِ بیقرار

ناشکیب ہستم بدہ ساقی مئے دیرینہ ام
باز می غلطد غمِ کہنہ درونِ سینہ ام

نشاطِ رفتہ

آہ بچپن کا زمانہ، آہ وُہ لیل و نہار
تھی بہارِ زندگی گویا بہار اندر بہار

چار سُو چھایا ہوا اِک شادمانی کا سماں
ہر طرف بے انتہا زِ رنگ و بُو سارا جہاں

آہ وُہ دن بے نیازِ شورشِ جذبات تھے
یاد آتے ہیں ابھی نا آشنائی کے مزے

آہ وُہ کھوئی ہوئی معصومیت کی کائنات
جب کہ تھے نا آشنائے کاوشِ خارِ حیات

پھر وُہ طوفانِ بلا وہ آمدِ عہدِ شباب
سازِ ہستی میں وہ پہلی لرزشِ تارِ رباب

ہو گئی خوابیدہ ذرّوں میں نمودِ ارتعاش
مضطرب رکھنے لگی زلفِ پریشاں کی تلاش

ہر طرف اک حُسن کی دنیا نظر آنے لگی
زندگی تھی خواب اور خوابِ پریشاں زندگی

کر دیا پھر بے نیازِ گردشِ دوراں مجھے
حُسن کی دُنیا میں لے آیا دلِ حیراں مجھے

زندگی کی کاوشیں آنکھوں سے پنہاں ہو گئیں
آرزوئیں نغمۂ سازِ رگِ جاں ہو گئیں

تا کجا آخر بیانِ داستانِ زندگی
ہے سرابِ آرزو بحرِ روانِ زندگی

سچ ہے بہار زندگانی کے یہی دن تین چار — جا کے پھر آتی نہیں بستان ہستی میں بہار

اب کہاں بیتابیاں وہ آرزو وہ اضطراب — وہ جنونِ شوق وہ رنگینیٔ عہدِ شباب

شب کی تنہائی، حریم دل، کسی کی انتظار
بس یہی لے دے کے ہے باقی پرانی یادگار

عدؔم

(سنہ ۱۹۰۹ء ———)

سیّد عبدالحمید صاحب عدؔم جون سنہ ۱۹۰۹ء میں گوجرانوالہ سے چار کوس کے فاصلہ پر ایک گاؤں "تلونڈی موسے خاں" میں پیدا ہوئے۔ جو اُن کے آباد اجداد کا وطنِ مالوف ہے۔ انکے آباواجداد محکمۂ فوج سے منسلک رہے۔ چنانچہ دادا سیّد مہتاب شاہ بھی فوج میں صوبیدار تھے لیکن انکے والد نے فوج کی ملازمت پسند نہ کی۔ اور لاہور آکر مستقل سکونت اختیار کر لی یہیں ملازمت بھی کی اور تادمِ آخر لاہور میں ہی رہے حضرتِ عدؔم نے چونکہ تعلیم و تربیت لاہور میں ہی حاصل کی ہے۔ اور پرورش بھی یہیں پائی ہے۔ اسلئے انکا وطن اب لاہور ہی ہے۔ گاؤں میں جو جائداد تھی وہ کچھ تو انکے والد نے فروخت کر دی۔ اور جو باقی بچی وہ سنہ ۱۹۲۶ء میں انہیں خود فروخت کرنی پڑی۔ کیونکہ والد کی وفات کے بعد اپنی تعلیم کو جاری رکھنے اور دیگر اخراجات کی کفالت کے لئے اس کے سوا چارہ

نہ رہا۔

قدرت کے ودیعت کردہ ذوقِ شعری کا ادراک اسکول کی زندگی میں بھی تھا لیکن شعر کہنا انٹرنس کے بعد ۱۹۲۶ء میں شروع کیا۔ شرف تلمذ کسی سے حاصل نہیں۔ چنانچہ راقم الحروف کو لکھتے ہیں "اُستادی شاگردی کو ابتدا رسے ہی میں ایک مہمل چیز سمجھتا تھا۔ نہ میں نے کوئی استاد بنایا اور نہ میرا کوئی شاگرد ہے"۔

آپ کی شادی ۱۹۲۷ء میں ہوئی۔ اور متاہلِ زندگی کی روز افزوں ضرورتوں سے آپ کو تعلیم ختم کر کے ملازمت کی طرف رجوع کرنا پڑا۔ چنانچہ ۱۹۲۸ء میں آپ آڈیٹر کی حیثیت سے ملٹری اکاؤنٹس ڈیپارٹمنٹ، راولپنڈی میں ملازم ہو گئے۔ جہاں تاہنوز مقیم ہیں۔

حضرتِ عدمؔ شعر کہنے میں اپنے مخصوص رنگ کے مالک ہیں۔ غزل کم کہتے ہیں۔ اکثر نظم لکھتے ہیں لیکن قلیل مشق کے باوجود کلام میں وہ پختگی موجود ہے جو اکثر شعراء کو سالہا سال کی مشق کے بعد بھی میسر نہیں آتی۔

نقشِ دوام:۔ یہ حضرت عدمؔ کے کلام کا مجموعہ ہے جس پر حضرت نیاز فتحپوری نے نہائت وقیع تعارف لکھا ہے۔

انتخابِ کلام

گھٹا

اٹھی ہے جھوم کر گھٹا سرور مے لئے ہوئے   سرودِ بیخودی کی دلنوازئے لئے ہوئے
جوان ہو گیا ہے جس سے دل وہ شئے لئے ہوئے

گھٹا نہیں سمندروں کی کوئی مست لہر ہے   گھٹا نہیں کوئی سپہر گرد موجِ بحر ہے
گھٹا نہیں جنوں فروش مستیوں کی نہر ہے

بہار کی پری کا حُسنِ دلنواز ہے گھٹا   نگارِ دلفریب کی ادائے ناز ہے گھٹا
طلسم ساز ہے گھٹا فسوں طراز ہے گھٹا

گھٹا نہیں مجسمہ ہے بیخودی کے رنگ کا   گھٹا نہیں سرود ہے شباب کی امنگ کا
گھٹا نہیں پیام ہے نشاط کی ترنگ کا

یہی گھٹا مگر دکھے دلوں میں غم کی آگ ہے   فغاں نصیب کوئلوں کا جانگداز راگ ہے
گھٹا نہیں غمِ فراق کا سیاہ ناگ ہے

لازم ہے دوستی میں خیال احتیاط کا
بیگانگی مآل نہ ہو ارتباط کا
دل پر محیط ہو کے تمہاری نگاہ نے
اندازہ کر لیا ہے ہماری بساط کا

سو بار روح بن گئیں دُنیا شناسیاں
اللہ! سادگیٔ طبیعت کو کیا ہوا
مانا! نگاہِ شوق کو دھوکا ہوا مگر
کمبخت دل کی تیز بصارت کو کیا ہوا

مرے فسانۂ وارستگی کی جاں ہو تم
میں داستان ہوں خلّاقِ داستاں ہو تم
یہ داستانِ محبت جو چھیڑ بیٹھے ہو
خبر بھی ہے کہ خود اس داستاں کی جاں ہو تم
تمہارے حُسن کی فطرت کا آئینہ ہوں میں
مرے جنوں کی حقیقت کے ترجماں ہو تم
حریمِ روح میں سے چاندنی سی پھیلی ہوئی
مرے حواس میں مانندِ بُو نہاں ہو تم
مرے خیال کی رعنائیوں کا مرکز ہو
مری نگاہ کا اِک خوابِ نوجواں ہو تم

رنگ و نور

رنگوں کے جلوؤں میں برق کی رو، اور برق کی رو میں مستی ہے

اے حسن و جوانی کے پیکر، ہستی بھی تری کیا ہستی ہے

ہر سانس میں ہے اندازِ جنوں، یا وصفِ سرور و کیفِ فزوں
یا ٹھنڈی ہوا کی موجوں میں آمیزشِ نکہت و مستی ہے

رفتار وہ جس میں غلطاں ہے گھنگھور گھٹاؤں کا موسم
گفتار وہ جس سے تھم تھم کر صہبا کی روح برستی ہے

اعضا کی لچک میں ہنستی ہے رہ رہ کے نزاکت کلیوں کی
کلیوں کی نزاکت رہ رہ کر اعضا کی لچک میں ہنستی ہے

غنچے سے ٹپکتے ہیں پیہم، ادراک کے نازک شیشے میں
ہے تیری نظر، اے جانِ عدمؔ! یا شعر و ادب کی بستی ہے

وہ رات

اب تک ہے یاد وہ شبِ مہتاب ہمنشیں
جو بن کے رہ گئی ہے بس اک خواب ہمنشیں

تیرے لبوں پہ چھایا ہوا اک سرور تھا
ہلکے سے اک لطیف تبسم کا نور تھا

مخمور چاندنی میں ترا پیکرِ حسیں!
معلوم ہو رہا تھا کوئی خوابِ عنبریں

اُترا ہوا تھا عرش سے اک کیف سرمدی
پھیلی ہوئی تھی بربطِ زہرہ کی راگنی

تیری حسین زلفوں پہ تھی چاندنی نثار
قربان ہو رہی تھی ترے جسم پر بہار

زلفوں کی طرح بکھرے ہوئے تیرے ہار تھے
میرے حواس تیری نظر پر نثار تھے

تیری ہر ایک سانس میں تھی مے ملی ہوئی
میرے جوان دل کی کلی تھی کھلی ہوئی

بھولا ہوا تھا میں کہ ہے اوقات کیا مری
دُنیا سے کھو چکی تھی مجھے میری بےخودی

میں تھا، مرا غرور تھا اور تیری رات تھی
اے ہمنشیں وہ رات بھی کیا مست رات تھی

وہ رات پھر بھی آئیگی کیا؟ پوچھتا ہوں میں
اُس رات کی تلاش میں کھویا گیا ہوں میں

درسِ زندگی

چھا گیا ہے رات کا جادو جہاں پر ناگہاں
جھلملا اُٹھے ستارے آسماں پر ناگہاں

ہلکا ہلکا ابر بھی چھایا ہے مغرب کی طرف
مضمحل سا کچھ سماں پیدا ہے مغرب کی طرف

بادلوں کی تیرگی میں چاند بھی ہے جلوہ گر
ظلمتوں میں دھیمی دھیمی روشنی ہے جلوہ گر

شب کا استغراق اور ایّامِ رفتہ کا خیال
کس قدر رنگیں ہے صبح و شامِ رفتہ کا خیال

غرق ہیں خاموش نظریں محفلِ افلاک میں — فکر کے موتی ہیں غلطاں دامنِ ادراک میں

کل فضائے دہر تھی معمورِ انوارِ طرب — محفلِ دُنیا نظر آتی تھی گلزارِ طرب
آج لیکن ایک غم خانہ ہے بزمِ کائنات — ایک وحشت خیز ویرانہ ہے بزمِ کائنات
کیا ستم ایجادِ دُنیا کا یہی دستور ہے — کل جو دل اک پھول تھا وہ آج اک ناسور ہے

اِک روش پر ہی نہیں قائم نظامِ کائنات — ہے تغیر آشنا دائم نظامِ کائنات
رنج ہے تو رنج میں آمیزشِ راحت بھی ہے — چار دن کی زندگی دوزخ بھی ہے جنت بھی ہے
محفلِ عشرت میں ہے سامان بزمِ غم کا بھی — ساغرِ غم میں نہاں ہے خون جامِ جم کا بھی
عارضی ہے رنج تو راحت بھی ہے ناپائدار — آرزو فانی ہے گر حسرت بھی ہے ناپائدار
لیکن ان نیرنگیوں کی کوئی آخر حد بھی ہے — آدمی کی زندگانی کا کوئی مقصد بھی ہے

ایک ہنگامہ بپا ہے محفلِ آفاق میں — بجلیاں بیتاب ہیں خرمنِ دلِ آفاق میں
منتظم ہے بیقراری کارگاہِ دہر میں — جادہ پیما ہیں مسافر یعنی راہِ دہر میں
ہے ازل سے دلشکن تقدیر کا آزار بھی — ساتھ جس کے گرم ہے تدبیر کا بازار بھی

نعرہ زن ہیں ہاؤ ہو سے محفلیں ایام کی | ہیں یونہی زور آزما آویزشیں اقوام کی
زیست کے ہاتھوں میں لیکن موت ہی کا جام ہے | کیا ہماری زندگی کا ایک ہی انجام ہے

چونکتے ہیں ارضِ ساکت میں شرارِ ادراک کے | یعنی دل بنکر دھڑک اٹھتے ہیں ذرے خاک کے
نغمہ زن ہوتا ہے خوابیدہ فضا میں سازِ غیب | ناگہاں کانوں میں یوں آتی ہے اِک آوازِ غیب
اے اسیرِ وہم، اے مسحورِ تنویرِ خیال | سُن رہا ہے کتنی محویت سے تقریرِ خیال
کیا گذر جاتے ہیں یونہی روز و شب تیرے لئے | کیا نظامِ دہر ہے لہو و لعب تیرے لئے
بے خبر ہر لمحہ تیری عمر کا نایاب ہے | بے خبر ہر لمحہ فردوسِ عمل کا باب ہے
بے نیازِ رنج و راحت ہو کے کوئی کام کر | جادوئے حُسنِ عمل سے قلبِ گیتی رام کر
ہو سکے تجھ سے اگر ٹوٹے ہوئے دل جوڑ دے | غم کے آنسو پونچھ کر ٹوٹے ہوئے دل جوڑ دے

جو یہاں اپنی ہی دُھن میں غرقِ بحرِ مدہوشی ہے
اُسکی ہستی غمزدہ دُنیا کو بارِ دوش ہے

راشد

(سنہ ۱۹۱۰ء ـــــــــ)

نذر محمد راشد یکم اگست سنہ ۱۹۱۰ء کو اکال گڑھ ضلع گوجرانوالہ میں پیدا ہوئے تاریخی نام "خضر عمر" رکھا گیا لیکن رائج نہ ہوا۔ آپ جنجوعہ خاندان کے موقر افراد میں سے ہیں۔ کچھ عرصہ قبل آپ کے آبا و اجداد ریاست گڑھ مکھیالہ ضلع جہلم کے والی تھے۔ آپ کے دادا ریٹائرڈ ڈاکٹر ہیں۔ اور والد ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف سکولز ہیں ابتدائی درجوں سے لیکر میٹریکولیشن تک آپ اکال گڑھ گورنمنٹ ہائی سکول میں پڑھتے رہے۔ انٹرمیڈیٹ لائلپور کالج سے پاس کیا۔ اور کالج میں اول رہنے کے علاوہ وظیفہ حاصل کیا۔ پھر لاہور آکر بی۔ اے اور ایم۔ اے (اقتصادیات) کے امتحان پاس کئے۔ کچھ عرصہ تک جریدہ "شاہکار" کی ادارت کے فرائض انجام دیتے رہے۔ اور پھر ملتان کمشنری میں ملازم ہو گئے۔

شاعری کا شوق بچپن سے تھا۔ پہلی نظم ایک سکھ انسپکٹر کی ہجو تھی دوسری

نویں جماعت میں لکھی ۔ بی ۔ اے میں پہنچکر آپ کی شاعری میں انقلاب عظیم رونما ہوا راشد محسوس کرنے لگا کہ شاعر ہونے کی حیثیت سے وہ دنیا کے سامنے کوئی نئی چیز پیش کریگا ۔ کچھ عرصہ تک اختر شیرانی، روش صدیقی اور حضرت عابد کے ہلکے ہلکے اثرات نظموں میں نظر آتے رہے لیکن راشد کی باغی فطرت اُسے سب سے الگ شاہراہ پر لے کر نکلی ۔ اور اِس کامیابی کے ساتھ کہ کسی مجتہد شاعر کو شائد ہی نصیب ہوئی ہو ۔ ابتدا میں عشقیہ اور غنائیہ نظمیں بھی لکھیں ۔ الفاظ کا انتخاب کرتے وقت راشد ہمیشہ خوش آئند الفاظ کی جستجو کرتا ہے لیکن نہ اِس غرض سے کہ نفسِ مضمون موسیقیت میں گم ہو جائے ۔ بلکہ اِس لئے کہ جب وہ یہ بیان کرنا چاہتا ہے ۔ کہ وہ دنیائے رومان و محبت کے حسین و جمیل مناظر کو آغوشِ ذہن میں لئے ہوئے ہے تو قاری بھی یہ محسوس کرنے لگے ۔ کہ شباب و رومان کے مرقعوں کو چھو رہا ہے اور دیکھ رہا ہے ۔ اُسکے اشعار کے الفاظ اِس کامیاب وضاحت سے آپ کے سامنے وہ چیزیں پیش کرتے ہیں ۔ کہ ساری نظم اُبھرتے ہوئے نقوش کا ایک منظر بن جاتی ہے ۔

راشد دیکھنے میں ضرورت سے زیادہ معمر ہے لیکن جب چند لمحوں کے لئے گفتگو کرتا ہے ۔ تو وہ اپنے چشمہ کے باوجود سراپا معصومیت کی تصویر بن جاتا ہے میرے ایک بے تکلف اور فطرتاً مخلص دوست جب پہلی دفعہ راشد سے ملنے گئے

تو مراجعت پر مجھ سے کہا: دوست میرا تو خیال تھا کہ کوئی تکلف نواز آدمی ہوگا۔
لیکن وہ تو بالکل میری طرح کا آدمی ہے، مراد یہ تھی۔ کہ اجنبی ملاقی بھی راشد کے خلوص
سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

انتخابِ کلام

آنکھوں کا فسوں

کیسے پھیلائے ہیں تیری مد بھری آنکھوں نے جال!
میز کی سطح درخشندہ کو دیکھ،
کیسے پیمانوں کا عکس سیمگوں،
اس کی بے اندازہ گہرائی میں ہے ڈوبا ہوا!
ایسے میری روح، میری زندگی،
تیری تابندہ سیاہ آنکھوں میں ہے!
اور پھر پیمانے ہٹ سکتے ہیں یہ ہٹتی نہیں!

قہوہ خانے کے شبستانوں کی خلوت گاہ میں

آج کی شب تیرا دُزدانہ وُرود

عشق کا ہیجان، آدھی رات اور تیرا شباب!

تیری آنکھ اور میرا دل،

عنکبوت اور اُس کا بے چارہ شکار!

تیرے ہاتھوں میں مگر لرزش ہے کیوں

تیرے ہاتھوں سے ترا پیمانہ گر جانے کو ہے!

یعنی جیسے اِک جواں ساحر کرے

اپنے فن کو آشکار

اور اپنے آپ پر اُس کو یقین حاصل نہ ہو

پھر بھی ہے تیرے فسوں کے سامنے مجھ کو شکست

میرے تخیلات میری شاعری بیکار ہیں!

اپنے سر پر برق کی تنویر کا سیلاب دیکھ

جس سے تیرے چہرے کا سایہ ترے سینے پہ ہے

اس طرح اندوہ میری زندگی پر سایہ ریز،
تیری آنکھوں کی درخشانی سے ہے،
سایہ ہٹ سکتا ہے غم ہٹتا نہیں!

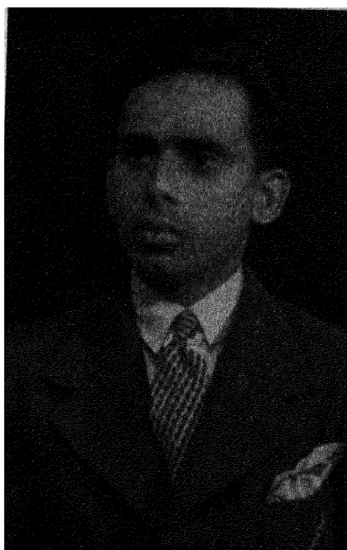
آہ تیری مدبھری آنکھوں کے جال!
سامنے دیوار پر تصویر دیکھ،
یہ اگر چاہے کہ اِس کا آفرنیندہ کبھی
اسکے ہاتھوں میں ہو مغلوب و اسیر
کیسا بے معنی ہو یہ اسکا خیال
اسکو پھر اپنی ہزیمت کے سوا چارہ نہیں!
تو مری تصویر تھی،
میرے ہونٹوں نے تجھے پیدا کیا!
آج لیکن میری مدہوشی کو دیکھ
میں کہ تھا کہ خود آفرنیندہ ترا،
پا بجولاں میرے جسم و روح تیرے سامنے،

اور دل پر تیری آنکھوں کی گرفتِ ناگزیر!
ساحری تیری، خداوندی تری!
عکس کیسا بھی ہو فانی ہے مگر
تیری آنکھوں کا فسوں پایندہ ہے!

عہدِ وفا

تو مرے عشق سے مایوس نہ ہو،
کہ مرا عہدِ وفا ہے ابدی!
شمع کے سائے سے دیوار پہ محراب سی ہے
سالہا سال سے بدلا نہیں سائے کا مقام
سائے کا عہدِ وفا ہے ابدی!
تو مری شمع ہے میں سایہ ترا
زندہ جب تک ہوں کہ سینے میں ترے روشنی ہے
کہ مرا عہدِ وفا ہے ابدی!

اک پتنگا سرِ دیوار چلا جاتا ہے
خوف سے سہما ہوا خطروں سے گھبرایا ہوا،
اور سایے کی لکیروں کو سمجھتا ہے کہ ہیں
سرحدِ مرگ و حیات اُس کے لئے،
اور یہی حال مرے دل کی تمناؤں کا ہے
پھر بھی تو عشق سے مایوس نہ ہو
کہ مرا عہدِ وفا ہے ابدی!



حفیظ ہوشیارپوری

حفیظ ہوشیارپوری

(سنہ ۱۹۱۲ء ــــــــ)

شیخ عبدالحفیظ سلیم صاحب حفیظ ہوشیارپوری ۵ جنوری سنہ ۱۹۱۳ء مطابق ۵ محرم سنہ ۱۳۳۱ھ بروز جمعہ لائلپور سے بارہ میل کے فاصلے پر ضلع جھنگ کے ایک گاؤں دیوان پور میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والدِ مرحوم کا اسم گرامی شیخ فضل محمد خاں تھا۔ ابتدائی تعلیم کا بیشتر زمانہ اسلامیہ ہائی سکول ہوشیارپور میں صرف ہوا۔ اور وہیں سے سنہ ۱۹۲۹ء میں انٹرنس کا امتحان پاس کیا۔ سنہ ۱۹۳۱ء میں گورنمنٹ کالج، ہوشیارپور سے انٹرمیڈیٹ میں کامیابی حاصل کی۔ اور گورنمنٹ کالج لاہور میں داخل ہو گئے۔ چنانچہ سنہ ۱۹۳۳ء میں بی۔ اے اور سنہ ۱۹۳۶ء میں ایم۔ اے (فلسفہ) کے امتحانات گورنمنٹ کالج سے پاس کئے۔

اس وقت آپ "انجمن اردو پنجاب" کے اسسٹنٹ سکرٹری ہیں۔ اور میاں بشیر احمد صاحب بی۔ اے۔ (آکسن)، بیرسٹرایٹ لاء مدیر ہمایوں، وسکرٹری انجمنِ مذکور کی معیت میں "اردو" کی ترویج و اشاعت میں کوشاں ہیں۔

خاندانی روایات کی وجہ سے بچپن ہی میں شعر کہنے کا شوق پیدا ہوگیا تھا۔ گھر میں ہر وقت شعر و سخن کا چرچا رہتا تھا۔ آپ کے نانا صاحب شیخ غلام محمدؒ صاحب مرحوم جو پرانے مکتبوں کے فارغ التحصیل تھے فارسی میں کافی مہارت رکھتے تھے۔ انہیں اردو و فارسی کی بہت سی نظم و نثر کی کتابیں حفظ تھیں۔ فرصت کے وقت کسی کتاب کا کوئی حصہ زبانی سناتے اور پھر اُس کی تشریح کرتے۔ سنہ ۱۹۳۰ء میں آپ کے انتقال کے بعد یہ سلسلہ ختم ہوگیا۔ اس کے بعد حفیظؔ کا ذوق سخن زیادہ تر اپنے بڑے بھائی شیخ عبدالرشید خاں صاحب راحلؔ کے فیضان صحبت کا مرہونِ منت رہا۔ راحلؔ صاحب مدت تک ادبیات سے دلچسپی لیتے رہے ہیں۔ اور اب اگرچہ وہ گوشہ نشین ہیں لیکن آپ کا واحد شغل مطالعہ اور تصنیف و تالیف ہے، راحلؔ صاحب کے ساتھ اکثر گرامیؔ صاحب کی دلچسپ صحبتوں میں شریک ہوتے رہے۔ اُن دنوں گرامی صاحب کی صدارت میں مشاعرے منعقد ہوا کرتے تھے۔ جن کی وجہ سے مشقِ سخن جاری رہتی۔ سنہ ۱۹۲۷ء میں مولانا گرامی کا انتقال ہوا تو آپ نے فارسی میں قطعہ تاریخ اور مرثیہ لکھا۔ اور یہ مشہور شعر بھی جو غلطی سے مولانا گرامی سے منسوب کیا جاتا ہے۔ انکے انتقال کے وقت حفیظؔ نے کہا تھا ؎

صبا بہ حضرتِ اقبالؔ ایں پیامم دہ برفت جان گرامی و تو ہنوز خموش

اس وقت آپ نویں جماعت میں پڑھتے تھے۔

انٹرمیڈیٹ کالج ہوشیارپور میں داخل ہوتے ہی چند باذوق اساتذہ مل گئے۔ چنانچہ آپ کو کالج میگزین کا ایڈیٹر اور "بزمِ سخن" کا سکرٹری بنادیا گیا۔ اسکے علاوہ فلسفہ اور تاریخ کی مجلسوں کے بھی سکرٹری رہے۔

گورنمنٹ کالج لاہور میں صوفی غلام مصطفےٰ تبسّم اور سیّد احمد شاہ صاحب بخاری کی علمی وادبی صحبتیں بہت کارگر ثابت ہوئیں۔ گورنمنٹ کالج میں چار سال تک "بزمِ سخن" کے سکرٹری رہے۔ اسکے علاوہ "مجلسِ اردو" اور برٹش فلوسوفیکل سوسائٹی میں اردو اور انگریزی میں ادبی اور علمی مقالات پڑھتے رہے۔ ابتدا سے ہی انگریزی شاعری کی طرف بہت رغبت تھی۔ چنانچہ پروفیسر ڈکنسن صاحب کی صحبت کے اثر سے چند انگریزی نظمیں لکھیں جو وقتاً فوقتاً کالج میگزین میں چھپتی رہیں۔

حفیظ صاحب کا کلام بتا رہا ہے۔ کہ اُن کا ذوقِ سلیم کبھی نہ کبھی دن اُنہیں ہندوستان کے صفِ اولین شعرا میں لا کھڑا کرے گا۔ ان کی موجودہ شاعری کسی عظیم الشان انتہا کی پیشگوئی کر رہی ہے۔ آپ گاہے گاہے اردو کی نظموں میں ہندی کے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ یہ امتزاج بہت پُر لطف ہوتا ہے۔ کیونکہ

اشعار کی یہ صورت ہم ہندیوں کے جذبات اور ادراک کو فارسی اور عربی تراکیب سے نسبتاً زیادہ متاثر کرتی ہے۔ آپ ہر صنفِ سخن میں شعر کہتے ہیں۔ چند انگریزی نظموں کے ترجمے بھی کئے ہیں "جدید" شاعری کے نمونے بھی آپکے کلام میں نظر آئیں گے۔

انتخابِ کلام

غزل

رازِ سر بستہ محبت کے زباں تک پہنچے — بات بڑھ کر یہ خدا جانے کہاں تک پہنچے

کیا تصرف ہے ترے حسن کا اللہ اللہ — جلوے آنکھوں سے اتر کر دل و جاں تک پہنچے

تری منزل پہ پہنچنا کوئی آسان نہ تھا — سرحدِ عقل سے گذرے تو یہاں تک پہنچے

حیرتِ عشق مری حسن کا آئینہ ہے — دیکھنے والے کہاں سے ہیں کہاں تک پہنچے

کھل گیا آج نگاہیں ہیں نگاہیں اپنی — جلوے ہی جلوے نظر آئے جہاں تک پہنچے

دل ہی اس گوشہ داماں کی حقیقت جانے — جو مرے دیدۂ خوننابہ فشاں تک پہنچے

ابتدا میں جنہیں ہم ننگِ وفا سمجھے تھے   ہوتے ہوتے وہ گلے حسنِ بیاں تک پہنچے

آہ وہ حرفِ تمنا کہ نہ لب تک آئے   ہائے وہ بات کہ رُک رُک کے زباں تک پہنچے

کس کا دل ہے کہ سُنے قصۂ فرقت میرا   کون ہے جو مرے اندوہِ نہاں تک پہنچے

خلش انگیز تھا کیا کیا تری مژگاں کا خیال   ٹوٹ کر دل میں نشتر رگِ جاں تک پہنچے

نہ پتہ سنگِ نشاں کا نہ خبر رہبر کی   جستجو میں تری دیوانے یہاں تک پہنچے

نہ غبارِ رہِ منزل ہے نہ آوازِ جرس   کون مجھ رہروِ گم کردہ نشاں تک پہنچے

صاف توہین ہے یہ دردِ محبت کی حفیظ

حُسن کا راز ہو اور میری زباں تک پہنچے

کچھ مجھے جرأت ہوئی کچھ اُنکی آنکھیں جھک گئیں   ہوتے ہوتے یوں ہی اظہارِ تمنا ہو گیا

لطف آنے لگا جفاؤں میں   وہ کہیں مہرباں نہ ہو جائے

کہا ہے کس نے تمہیں بے وفا سنو تو سہی   نظر ملاؤ تو ہم سے ذرا سنو تو سہی

انتہائے یاس

مرے قلبِ ناشکیبا

یہ نہیں امید مجھ کو کہ سنیں وہ حال میرا
ہے یہی مجھے غنیمت رہے انتظار اُن کا

مری چشمِ منتظر کو

مگر ایک بات کہہ دوں اسے مان لے اگر تو
مرے دیدہ ہائے محزوں سے گرے نہ کوئی آنسو

مجھے یاد ہے زمانہ

کہ وہ شوق سے تھے سنتے مرے عشق کا فسانہ
مرے درد و رنج و غم پر تھی نگاہ غائبانہ

وہ پھر آئے گا زمانہ

کہ سنیں گے شوق سے وہ مرے عشق کا فسانہ
مرے رنج و غم پہ ہو گی نظر اُن کی غائبانہ

مرے قلبِ ناشکیبا

یہ نہیں امید مجھ کو

مگر ایک بات کہدوں اسے مان لے اگر تُو
مرے دیدہ ہائے محزوں سے گرے نہ کوئی آنسو

آگ لگے اس من میں آگ

لو پھر رات برہ کی آئی جان مری تن میں گھبرائی
چاروں اور اُداسی چھائی اپنی قسمت اپنے بھاگ
آگ لگے اِس من میں آگ

کالی اور برسنی رین! اُس بن نیند کو ترسیں نین
جسکے ساتھ گیا سُکھ چین اُس کی یاد کہے اب جاگ
آگ لگے اِس من میں آگ

جس دن سے وہ پاس نہیں ہے کوئی خوشی بھی راس نہیں ہے
جینے تک کی آس نہیں ہے جان کو ہے اب تن سے لاگ
آگ لگے اس من میں آگ

سلہ سمت

کون جئے اور کس کے سہارے؟ میٹھے میٹھے بول سدھارے

گیت کہاں وہ پیارے پیارے اب وُہ تان نہ اب وُہ راگ

آگ لگے اس من میں آگ

درس دکھا کر جو چھپ جائے کون ایسے سے پیت لگائے

کیوں اپنی کوئی رسا سنائے چھوڑ محبت کا کھٹراگ

آگ لگے اس من میں آگ

چارہ[1] دردِ جگر ہونے لگا دشمن جاں چارہ گر ہونے لگا

پھر مری آنکھوں کی قسمت جاگ اٹھی پھر طوافِ بام و در ہونے لگا

بند کر آنکھوں کو اے عشقِ غیور حسن وقفِ رہگذر ہونے لگا

جسکے جلووں کو ترستی تھی نظر خود وہ محتاجِ نظر ہونے لگا

جان کر میرا تغافل آشنا حالِ دل سے بے خبر ہونے لگا

منزلِ مقصود آپہنچی حفیظ قصۂ غم مختصر ہونے لگا

اب تیری جفا کا مجھے احساس ہوا ہے تجھ سے بھی مرا حال جو دیکھا نہیں جاتا

جیتا ہوں کہ اُمیدِ ملاقات ہے تجھ سے خوش ہوں کہ ترا وعدۂ فردا نہیں جاتا

---

[1] یہ غیر مطبوعہ کلام ہے۔

کلیمؔ

(سنہ ۱۹۱۲ء ـــــــــــ)

ملک عطا اللہ صاحب کلیم ۱۶ اگست سنہ ۱۹۱۲ء کو راولپنڈی میں پیدا ہوئے۔ یہی ان کا وطن مالوف ہے۔ ابتدائی تعلیم اسلامیہ ہائی اسکول راولپنڈی میں حاصل کی۔ وہاں مولوی نیک عالم صاحب فیضیؔ کنجاہی کے علمی و ادبی ذوق نے ان کو خاص طور پر متاثر کیا۔ طبعی ذکاوت خدا داد تھی۔ مولوی صاحب خود ایک فاضل مصنف تھے۔ انہیں کہیں سے معلوم ہو گیا کہ کلیمؔ کی طبیعت کو شاعری سے لگاؤ ہے۔ چنانچہ انہوں نے بعض اوقات ان سے پیٹ پیٹ کر بھی نظمیں لکھوائیں۔ اسی اسکول میں سید محمدؐ صاحب ٹونکی (جواب۔ ایم۔ اے اواسکول میں ہیں) کے مفید مشوروں سے کلیم صاحب کو مستفیض ہونے کا موقعہ ملا۔ سید صاحب اعلےٰ درجہ کے نثار اور کہنہ مشق نقاد ہیں۔ انکی نقادانہ نکتہ چینیوں نے کلیمؔ کے کلام پر جلا کی اور وہ بہت جلدی صحیح شاہراہ پر

گامزن ہو گئے۔

ابتدائی تعلیم کے بعد آپ گارڈن کالج راولپنڈی میں داخل ہوئے۔ اور ایف۔ اے تک یہیں تعلیم پائی۔ اس کے بعد لاہور تشریف لائے اور فورمن کرسچین کالج سے امتیاز کے ساتھ۔ ایم۔ اے (انگریزی) کا امتحان پاس کیا۔ ابھی وہ بی۔ اے ہی میں تھے کہ اُن کی نظمیں لاہور کے بلند پایہ رسالہ 'ہمایوں' میں شائع ہونے لگیں۔ اُس وقت مولوی منصور احمد صاحب (مُدیر ادبی دنیا) 'ہمایوں' کے فرائض ادارت انجام دے رہے تھے۔ اسلئے کلیم صاحب کی نظموں میں منصور صاحب کا مشورہ بھی شامل ہوتا تھا۔ اسکے بعد حالات نے ایسا پلٹا کھایا۔ کہ کچھ عرصہ کے لئے انہوں نے اپنے کلام کی اشاعت بند کر دی۔ لیکن۔ ع

مذاقِ عشق دردِ مستقل ہے

اس لئے وہ اِس عرصہ میں بھی بدستور لکھتے رہے۔ اور اپنی نظموں کے مجموعہ کا نام "آتشکدہ" رکھا۔ دل پر کسے اختیار ہے۔ ایک وقت میں جو چیز عزیز ہوتی ہے دوسرے وقت انسان اسی سے بیزار ہو جاتا ہے۔ چنانچہ کلیم نے "آتشکدہ" کو نذرِ آتش کر دیا۔ اِس "آتشکدے" کی ایک چنگاری "یوں ہوتا تو کیا ہوتا" سالنامہ

ادبی دنیا" بابت ۱۹۳۴ء میں چمک کر اہل ذوق کے دلوں میں روشنی کر چکی ہے اور اسے انتخاب کلام میں درج کیا گیا ہے۔

کلیم شعر کم کہتے ہیں لیکن صانع ازل نے مذاق نہائت شستہ ودیعت کیا ہے۔ نثر نگاری بھی کرتے ہیں۔ اِنکے تراجم اور طبعزاد مضامین ملک کے متقدر جرائد میں شائع ہو کر اکثر اہل علم سے خراجِ تحسین وصول کر چکے ہیں؛

گفتگو کرتے وقت نہایت ہی سنجیدہ بلکہ متانت کے پُتلے بن جاتے ہیں کم گوئی انکا شعار ہے لیکن اس کے باوجود ہر وقت ایک لطیف سا تبسّم ان کے ہونٹوں پر کھیلتا رہتا ہے۔ جو ان سے کسی قسم کی شکایت پیدا نہیں ہونے دیتا ۱۹۳۶ء میں آپ انڈین آڈٹ اینڈ اکاونٹس کے مقابلے کے امتحان میں کامیاب ہوئے تھے اور اب راولپنڈی میں ملازم ہیں۔

انتخابِ کلام

آؤ! اب پھر اس سراپا نور سے باتیں کریں
بجلیوں سے ہم سخن ہوں طور سے باتیں کریں

آؤ! پھر اس شاہدِ مستور سے باتیں کریں
گر نہیں اس تک رسائی دُور سے باتیں کریں

آؤ! پھر اس غائب و موجود کی کرلیں تلاش
آؤ! پھر اس مخفی و مشہود سے باتیں کریں

آؤ! پھر چھیڑیں غمِ الفت کی رنگیں داستاں / آؤ! پھر ہر زخم کے انگور سے باتیں کریں

آؤ! پھر ہوں سایۂ دیوار و در سے ہمکلام / آؤ! پھر تنہا دلِ رنجور سے باتیں کریں

آؤ! پھر آنکھوں ہی آنکھوں میں جتائیں حالِ دل / آؤ! پھر اس نرگسِ مخمور سے باتیں کریں

آؤ! پھر سرشار ہوں پی کر شرابِ معرفت / سایۂ شمشیر میں منصور سے باتیں کریں

آؤ! ہوں جنگ آزما فرعون سے مثلِ کلیم
آؤ! پھر چنگیز اور تیمور سے باتیں کریں

یوں ہوتا تو کیا ہوتا

یہ خیال آتا ہے اکثر مرے دل میں کہ اگر / حسنِ خود کام مری طرح پریشاں ہوتا

دربدر جنسِ محبت کی گدائی کرتا / کوبکو عشق کے الطاف کا خواہاں ہوتا

دیکھتا عشق کی گرمی میں اگر کوئی کمی / سر پٹکتا درو دیوار سے، نالاں ہوتا

سر پکڑ کر کبھی روتا کبھی آہیں بھرتا / سینے پر ہاتھ دھرے طالبِ درماں ہوتا

آتشِ شوق میں ہر دم جو جلاتا ہے مجھے / آپ دل سوختۂ آتشِ حرماں ہوتا

گامزن ہوتا رہِ حق پہ بتِ عربدہ جو / منکرِ مہر و وفا مائلِ ایماں ہوتا

وُہ جو انکارِ مجسّم ہے وہ کرتا اقرار
کفر جس کا ہے مسلّم وہ مسلماں ہوتا

سامنے میرے کوئی مُغبچہ بادہ فروش
جام مے رکھ کے اِس انداز سے رقصاں ہوتا

کہ زمیں رشکِ گلزارِ جناں ہو جاتی
اُسکے جلوے سے چمن شعلہ بداماں ہوتا

پھر مرے سامنے رکھ دیتا وہ اِک نامۂ شوق
"عذرِ تقصیر" جسکے نامہ کا عنواں ہوتا

جسکی بیداد و جفا کا ہے جہاں میں چرچا
وہ جھکائے ہوئے سر عفو کا خواہاں ہوتا

اپنی ایک ایک جفا گن کے تاسف کرتا
میں جو چپ رہتا تو وہ اور پریشاں ہوتا

دیکھ سکتا نہ میں آنکھوں سے یہ رسوائی حُسن
بھول جاتا گلہ ہائے ستم آرائی حُسن

قصرِ خسرو

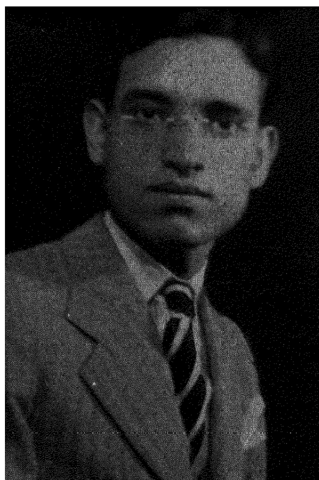
یہ گُل بوٹے نہیں خسرو کے ایوانِ فلک سا کے
جو سچ پوچھو تو ہیں یہ کوہکن کے خون کے چھینٹے

بنا ہے بیکسوں کے آب و گِل سے جامِ پرویزی
بھرا ہے کوہکن کے خونِ دل سے جامِ پرویزی

اُدھر تعمیر ہوتی ہے کسی ظالم کے ایواں کی
اِدھر مسمار کی جاتیں ہیں قبریں اہلِ ایماں کی

تماشا گاہِ عالم اک مقامِ یاس و عبرت ہے
کسی کا کاسۂ سر ہے، کسی کا پائے نخوت ہے

یہ قرباں گہ ہے جسمیں ہیں ہزاروں خوں کے فوارے
جہاں کے گوشے گوشے میں ہیں حسرتناک نظارے



ضیا فتح آبادی

ضیاؔ فتح آبادی

(سنہ ۱۹۱۳ء)

مہرلال صاحب ضیاؔ سونی خاندان کے چشم و چراغ ہیں۔ اور ۱۲ ؍ فروری سنہ ۱۹۱۳ء کو کپورتھلہ میں اپنے ماموں لالہ شنکر داس پوری کے مکان پر پیدا ہوئے۔ ویسے وطن مالوف فتح آباد ہے۔ جو امرت سر سے ۲۴ میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ آپ کی ابتدائی تعلیم خالصہ مڈل سکول پشاور میں ہوئی۔ جہاں آپکے والد ماجد بسلسلہ ملازمت مقیم تھے لیکن وہاں کچھ عرصہ رہنے کے بعد جے پور چلے گئے۔ جہاں ان کے والدِ محترم ایس۔ ڈی۔ او۔ کے عہدہ پر فائز ہوئے۔ اور وہیں سے مہاراجہ ہائی سکول میں تعلیم پاکر الہ آباد یونیورسٹی سے انٹرنس کا امتحان پاس کیا۔ سنہ ۱۹۳۱ء میں ہندو سبھا کالج امرت سر سے ایف۔ اے کے امتحان میں کامیاب ہوئے۔ اور سنہ ۱۹۳۳ء میں بی۔ اے۔ (آنرز) کی ڈگری کی تحصیل فورمن کرسچین کالج لاہور سے کی۔ بعد میں وہیں سے ایم۔ اے (انگریزی) کا امتحان پاس کیا۔

ضیاؔ کو شاعری کا مذاق وراثتاً نہیں ملا لیکن ذوقِ سلیم یقیناً وراثتاً ملا ہے کیونکہ آپ کے والدِ محترم کو موسیقی سے لگاؤ ہے۔ اور والدہ حد درجہ کی شفیق واقع ہوئی ہیں۔ اور ضیاؔ صاحب کے بقول اُنکے "تخیل اور احساسِ دل کی تخلیق" کی ذمہ دار اُن کی والدہ محترمہ ہی ہیں۔

حضرتِ ضیاؔ کے ذوقِ شعر گوئی کی اولیں تربیت جے پور میں اُنکے معلم جناب اصغر علی صاحب حیاؔ نے کی لیکن جے پور میں موزوں ماحول کے فقدان نے اس ذوق کی چنگاری کو شعلہ میں تبدیل نہ ہونے دیا۔ ۱۹۲۹ء میں جب آپ امرتسر آ گئے۔ تو اُس وقت اُنہوں نے محسوس کیا۔ کہ بحرِ شاعری کو عبور کرنے کے لئے کسی ناخدا کی مدد کی ضرورت ہے۔ چنانچہ آپ مولانا سیماب اکبر آبادی کے حلقہ تلمذ میں شامل ہو گئے۔ اور بذریعہ خط و کتابت اُن سے اصلاح لینا شروع کی۔ آپ کی سب سے پہلی غزل جریدہ "چمن" امرتسر میں شائع ہوئی ہے۔ اس کا مطلع مندرجہ ذیل تھا۔ ؎

کیا ٹھہر سکتا فروغِ روئے جاناں دیکھ کر   ہو گیا روپوش آخر مہرِ تاباں دیکھ کر

اِس وقت تک آپ چند ایک نہایت اعلےٰ درجے کی نظمیں لکھ چکے ہیں۔
کلام میں برجستگی اور موزونیت بدرجہ اُتم موجود ہے لیکن غزل کی نسبت نظم کہنا زیادہ پسند کرتے ہیں۔ آپکے قطعات ایک مخصوص رنگ کے حامل ہیں۔ بلکہ زیادہ

صحیح طور پر خود ضیاؔ کے جذبات کا صادق عکس ہیں۔ ضیاؔ "نظام پسند" "شاعر" نہیں بلکہ منتشائم "انسان" ہے۔ اور اس کی شاعری بیشتر انفرادی ہے۔ اس سلسلہ میں مجھے محبی منصور احمد صاحب مدیر "ادبی دنیا" کی اس رائے سے پورا پورا اتفاق ہے جو انہوں نے ضیاؔ کی شخصیت اور شاعری کے متعلق انکی تصنیف "طلوع" کو دیکھکر الفاظ ذیل میں ظاہر کی تھی۔ (دیکھو ادبی دنیا بابت ماہ مارچ ۱۹۳۴ء)

"ضیاؔ سے میرا تعارف کلیمؔ صاحب کے ذریعے سے ہوا۔ وہ انہیں ایک دن میرے دفتر میں لے آئے۔ اور صرف "حضرت ضیاؔ" کہ کر مجھ سے ملا دیا یہ ایک خاموش سے آدمی تھے ...... میں نے اسی وقت کتاب (طلوع) نکالکر انکے سامنے ہی اسے پڑھنا شروع کر دیا۔ ضیاؔ اور طلوع دونو میرے سامنے تھے۔ اور میں دیکھ رہا تھا۔ کہ ضیاؔ کی خاموش اور مغموم طبیعت کس صفائی کے ساتھ اُن کے کلام میں موجود ہے۔"

تصنیفات

حضرت ضیاؔ اس وقت تین کتابیں لکھ چکے ہیں۔ جن میں سے ایک تو شائع ہو چکی ہے اور باقی دو زیر طبع ہیں۔

۱۔ طلوع ۔ ادبی مرکز میرٹھ سے جناب ساغر نظامی کے اہتمام میں شائع

ہوئی ہے۔ چنانچہ اس کا دیباچہ بھی اُنہوں نے ہی لکھا ہے۔ اس میں مختلف موضوعات حیات پر شاعرانہ نقطۂ نگاہ سے قطعات کی صورت میں اظہارِ خیال کیا گیا ہے۔

۲۔ **تجلیات**۔ زیرِ طبع۔ حضرتِ ضیاؔ کی اُن نظموں اور غزلوں کا مجموعہ ہے جو اُنہوں نے ۱۹۳۴ء تک لکھی ہیں۔

۳۔ **کاروان** (زیرِ طبع) تذکرہ ہے۔ ان شعراء کا جو مولانا سیمابؔ اکبرآبادی کی جماعت سے متعلق ہیں۔ اس تذکرہ میں مختلف شعراء کے سوانح حیات نہایت شرح و بسط سے قلمبند کیے گئے ہیں۔ اور اُنکے کلام پر تنقید کی گئی ہے۔

انتخاب کلام

"شاہکارِ فطرت"

عورت کی تخلیق

(ایک بند)

آبِ کوثر سے روانی مانگ لی ‍ ‍ ‍ باغِ جنت سے جوانی مانگ لی
لی گلوں سے نکہتِ جاں آفریں ‍ ‍ ‍ بلبلوں سے نغمہ ہائے دلنشیں
مانگ لی نرگس سے چشمِ نیم باز ‍ ‍ ‍ شاخِ طوبیٰ سے ادائے دلنواز

موجِ بادِ صبح سے رفتار لی ۔۔۔ سوسنِ خاموش سے گفتار لی
زلفِ سنبل سے درازی مانگ لی ۔۔۔ سرو سے پھر سرفرازی مانگ لی
غنچہ ہائے نو سے لی معصومیت ۔۔۔ لی فضائے جانفزا سے عطریت
لالۂ صحرا سے سرخی مانگ لی ۔۔۔ بادۂ کوثر سے مستی مانگ لی
انجمِ تاباں سے لیں تابانیاں ۔۔۔ ماہ کے آئینے سے حیرانیاں
مہرِ روشن سے شعاعوں کو لیا ۔۔۔ اقتباسِ جلوۂ انور کیا
لی کشش کی تاب مقناطیس سے ۔۔۔ اور تھوڑی سرکشی ابلیس سے
لیں فرشتوں سے سکوں آمیزیاں ۔۔۔ موجِ غم سے اضطراب انگیزیاں

سب کو فطرت نے بہم یکجا کیا
پیکرِ نو ان سے اِک پیدا کیا

برسات کی ایک رنگین شام

نشاط افروز شامِ رنگیں لطافتوں کو بڑھا رہی ہے ۔۔۔ لئے ہوئے ساز بدلیوں کا شباب کے گیت گا رہی ہے
دلوں میں بیتاب ولولے ہیں، دماغ اور ہوش وقفِ سودا ۔۔۔ نگاہ کے سامنے تجلی بہار کی جگمگا رہی ہے
اگرچہ خورشید چھپ گیا ہے مگر ابھی تک شعاعِ آخر ۔۔۔ کہیں کہیں بادلوں میں منظر حسین و دلکش بنا رہی ہے

نشاطِ تقسیم ہو رہی ہے چمن چمن جنتیں بنی ہیں ٹپک رہی ہے جو بوندرس کی فلک سے غنچے کھلا رہی ہے
دلوں میں وحشت سروں میں سودا نگاہ مضطر حواس غائب گرج گرج کر سیاہ بدلی ہزار فتنے جگا رہی ہے

ہوا بھی رنگیں فضا بھی رنگیں زمیں بھی رنگیں فلک بھی رنگیں
غروبِ خورشید بھی ہے رنگیں طلوعِ شب کی جھلک بھی رنگیں

اور اسپہ یہ لطف جس نے میرے دماغ کو جذب کر لیا ہے نثار قدموں پہ جسکے مدت ہوئی دل زار ہو چکا ہے
میرے تصور کے آئینے میں ہے جسکا پرتو جمالِ امین جو میرے ٹوٹے ہوئے سفینے کا بحرِ ہستی میں ناخدا ہے

وہ سن رہا ہے میں داستاں اسکو اپنے دل کی سنا رہا ہوں
جو ساز بوندوں کا بج رہا ہے اسی پہ میں گیت گا رہا ہوں

محبّت

محبت لفظ تو سادہ سا ہے لیکن ضیا اس میں سمٹ آئی ہیں سب رنگینیاں گلزارِ ہستی کی
بیاں الفاظ میں اسکو کرے یہ تاب ہے کس میں کہ یہ اک آخری منزل ہے راہِ کیف و مستی کی
محبت سے ہے وابستہ ترقی روحِ انساں کی یہ رازِ عالمِ ایجاد سے آگاہ کرتی ہے

یہی تنظیم کرتی ہے خیالاتِ پریشاں کی — دلوں کو بے نیازِ حسنِ مہر و ماہ کرتی ہے
رواں ہیں میری رگ رگ میں محبت کی حسیں لہریں — نفس کی ہر صدا سے راگنیٔ الفت کی سنتا ہوں
تماشا حسن کا کرتا ہوں اکثر اسکے نغموں میں — محبت کی نوا سامانیوں پر سر میں دھنتا ہوں

محبت اِک حسیں نشتر ہے جو جذبِ رگِ جاں ہے
محبت میرا مذہب ہے محبت میرا ایماں ہے

جوانی

بہار و شعر و مستی کو لئے دامانِ رنگیں ہیں — جوانی ہر نظر کو حسن کا پیغام دیتی ہے
امید اور آرزو اور شوق کے ایوانِ رنگیں ہیں — شرابِ بیخودی کے جام صبح و شام دیتی ہے
جوانی سرمدی نغمے وہ عالم کو سناتی ہے — جنہیں سُنکر یقیں انساں کو آجاتا ہے ہستی پر
کہیں چشمے بہاتی ہے کہیں غنچے کھلاتی ہے — یہی مجبور کرتی ہے چمن کو خود پرستی پر
دلِ آزاد میرا بے نیازِ بانگِ رہبر ہے — یہ جس رستے پہ لے جاتا ہے اُس رستے پہ چلتا ہوں
نہ ڈر تنقیدِ عالم کا نہ خوفِ قہرِ داور ہے — جوانی ڈھالتی ہے مجھکو جس سانچے میں ڈھلتا ہوں

یہی دن ہیں جوانی کے محبت کے مسرت کے
ضعیفی کو مبارک حوصلے زہد و عبادت کے

ہوش ہی اب نہیں بلبل کو اُدھر جانے کا / فائدہ پھر چمنستان میں بہار آنے کا

ساقیٔ مستِ نظر آپ ہی ہے بزم فروز / ہوش رندوں کو کہاں بادہ و پیمانے کا

منزلِ ہوش میں کچھ بھی تو نہیں غم کے سوا / راستہ کوئی دکھا دے مجھے میخانے کا

نفسِ بازپسیں اور یہ شرحِ غمِ عشق / سلسلہ ٹوٹ نہ جائے کہیں افسانے کا

اے ضیاؔ ہوش ہے جنکو وہ بکھیڑے میں پڑیں

اُن کا دیوانہ تو کعبے کا نہ بتخانے کا

صبر کر صبر اے دلِ ناشاد / ہو نہ جائے جہانِ غم برباد

پھر ہوا ماہتاب جلوہ فگن / پھر مجھے آ گئی کسی کی یاد

چھپ کے پردے میں رات کے شاید / سن رہا ہے کوئی مری فریاد

دل کو بہلا رہا ہوں باتوں سے / روز کرتا ہوں اک نئی ایجاد

کیا یہی عشق ہے دلِ ناکام / مانگتا ہے وفا کی اپنی داد

اے ضیاؔ آدمی کو پھر نہ ملا

رتبۂ قیس و منصبِ فرہاد

نہ اب دل ہے نہ دل کی دادخواہی / ارے اُن کی نظر کی بے پناہی

کہیں اِن سادہ چند اشکوں سے اے دل / شبِ فرقت کی مٹتی ہے سیاہی

چھپانے سے ضیاؔ دیکھا ہے میں نے
نہیں چھپتی گناہوں کی سیاہی

قطعات

یہ وقت، یہ تاروں کا سماں بھول نہ جانا — جو قول دیا ہے مری جاں! بھول نہ جانا
جلتے ہو، نہ روکوں گا، مگر اتنا کہوں گا — پھر وعدے پہ آنا ہے یہاں! بھول نہ جانا

ہر آنکھ ہے مدہوش الٰہی توبہ — ہر قلب ہے مے نوش الٰہی توبہ
سمجھے کوئی کس طرح یہ دُنیا کیا ہے — ہر ذرہ ہے خاموش الٰہی توبہ

انجم و ماہ کہاں تک دیکھوں — اثرِ آہ کہاں تک دیکھوں
کب تک آؤ گے یہ معلوم تو ہو — اس طرح راہ کہاں تک دیکھوں

عشرتِ ناز سمجھتا ہوں میں — غم کا انداز سمجھتا ہوں میں
میری ہستی ہی تو ہستی ہے ضیاؔ — زیست کا راز سمجھتا ہوں میں

شبِ غم پُر اُمید ہوتی ہے — دل تڑپتا ہے آنکھ روتی ہے
تارے مجھ سے کلام کرتے ہیں — چاندنی میرے ساتھ سوتی ہے

کتبہ: محمد شریف عباسی کاتب اندرون لوہاری دروازہ لاہور

اعلان

تذکرہ شعرائے پنجاب (حصّہ دوم)

زیر طبع ہے۔ اس میں مندرجہ ذیل شعرا کی تصاویر کے علاوہ اُنکے سوانح حیات تصنیفات پر تبصرہ اور انتخاب کلام درج ہوگا:۔

حکیم احمد شجاع، چوہدری خوشی محمد ناظر، نواب احمد یار خاں دولتانہ، نشتر جالندھری، پنڈت ہرچند اختر سید امتیاز علی تاج، خواجہ دل محمد، مرتضٰے احمد خاں میکش، اختر علی خاں، سید احمد شاہ بخاری، ڈاکٹر تصدق حسین خالد، پروفیسر علم الدین سالک، اختر شیرانی، ڈاکٹر موہن سنگھ دیوانہ، پروفیسر محمد اکبر منیر، پنڈت میلا رام وفا، پروفیسر فیض احمد فیض، ابن حزیں، امرچند قیس، مجید ملک، انعام اللہ خاں ناصر اسد ملتانی، میاں محمد رفیق خاور، ابوالعلا چشتی، سراج الدین ظفر، اطہر حسین زاہدی، عطا اللہ سجاد، مرزا شیون مرحوم، احسان دانش، پروفیسر سراج الدین آذر، مرزا بیضا خاں، اظہر امرتسری، پروفیسر غلام ربانی عزیز پروفیسر غلام جیلانی برق، سید محمد جعفری، راجہ مہدی علی خاں، حاجی سرحدی، فضل الٰہی عارف، عرشی امرتسری فیروز الدین احمد طغرائی مرحوم، پروفیسر الیف۔ ایم۔ شجاع منعمی، پروفیسر جمیل واسطی، فاخر ہریانوی، نظیر لدھیانوی، نفیس خلیلی، ایف۔ ایم۔ ساقی، نذیر احمد مرغوب، میر ولی اللہ۔

اس جلد کی ضخامت ۴۰۰ صفحات سے زائد ہوگی قیمت دو روپے اشاعت سے پیشتر خریداری کا آرڈر بک کرانے والے اصحاب کو محصول ڈاک معاف۔

گجرات پرنٹنگ پریس گجرات (پنجاب)

۹-۱۳۱۶۹۱

مطالب محمد باقر لیکچرر

شعبہ عربی پنجاب

P 59-28-2-59

کتب خانہ

جامعہ عثمانیہ

۱- اراکین مجلس اعلیٰ، مجلس تعلیمی، مجلس انتظامی، مجالس تعلیمات و نصاب پانچ کتابیں ایک ماہ کے لیے اپنے پاس رکھ سکیں گے۔

۲- اساتذہ جامعہ عثمانیہ و کلیہ جات ملحقہ و گزیٹیڈ عہدہ داران جامعہ اور اراکین دارالترجمہ دس کتابیں ایک ماہ کے لیے اپنے پاس رکھ سکیں گے۔

۳- طلبا ایم اے، ایل ایل بی و جماعت سال آخر تین کتابیں اور دیگر طلبہ دو کتابیں دو ہفتے تک اپنے پاس رکھ سکیں گے۔

۴- مدت مقررہ پر کتابیں واپس نہ ہونے پر فی کتاب ایک آنہ یومیہ جرمانہ وصول کیا جائے گا۔

۵- بیش قیمت کتابیں گھر پر جاری نہ کی جا سکیں گی۔

۶- کتابوں میں کوئی نشان وغیرہ نہ لگایا جائے۔ کتاب کا خراب ہونا یا گم ہونا ذمہ داری لینے والے پر عائد ہوگی۔

۷- کتابوں پر کسی قسم کا نشان یا حاشیہ نہ لکھا جائے۔

۸- قلمی نسخے و نادر کتابیں جاری نہ کی جا سکیں گی۔ فقط